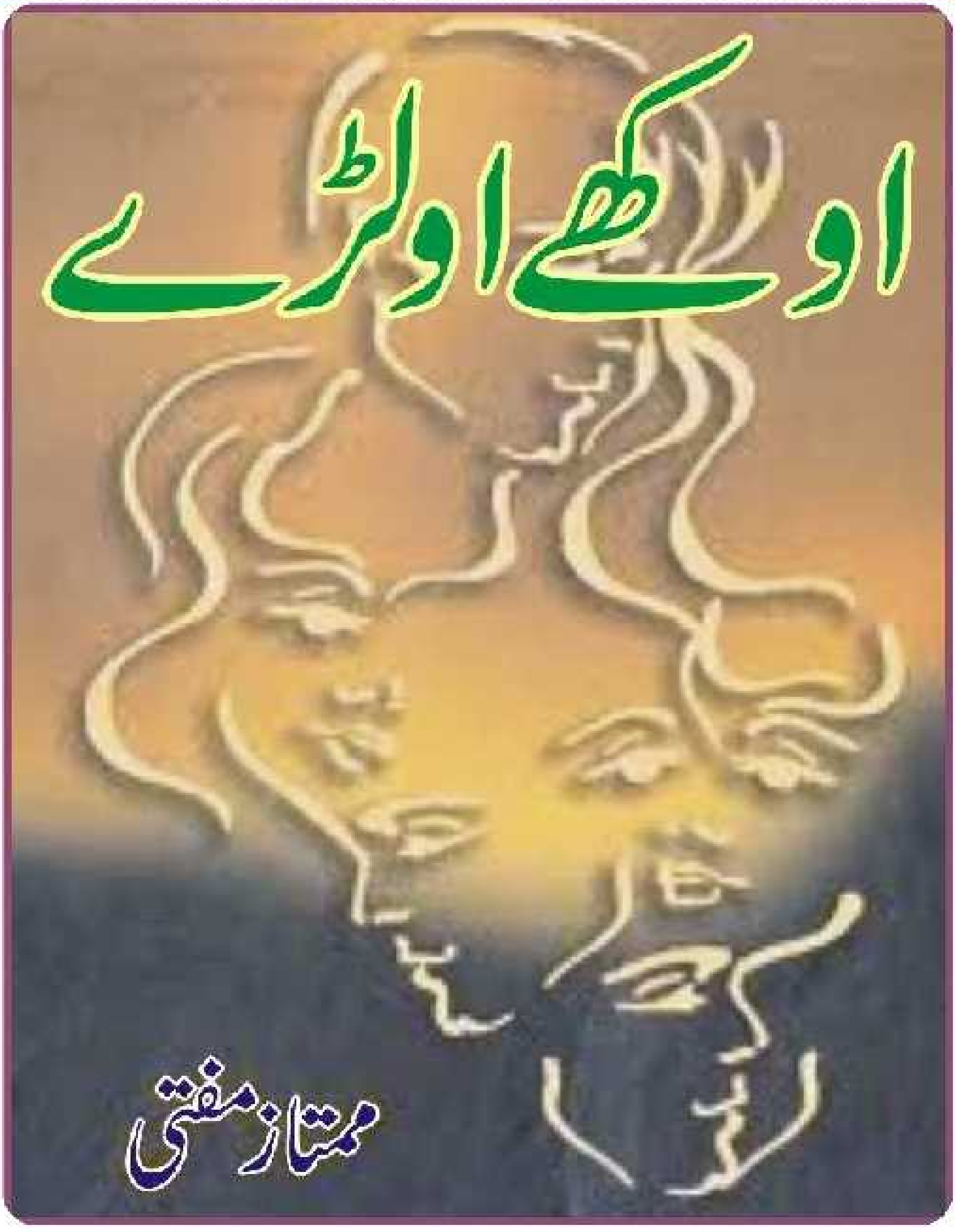

اوکھے اولڑے
ممتاز مفتی

اوکھے اولڑے

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی

کتاب کی بات

ناقد کہتے ہیں مفتی شخصیت لکھتے وقت صرف صاحب شخصیت کی بات نہیں کرتا۔ خود بھی شخصیت پر سوار رہتا ہے۔

وہ سچ کہتے ہیں۔

برٹ رینڈ رسل سے کسی نے پوچھا' تم کیا چاہتے ہو؟

بولا' میں چاہتا ہوں کہ میری نگاہ اللہ کی نگاہ جیسی ہو جائے۔ نہ لاگ رہے نہ لگاؤ۔

میں نہیں چاہتا کہ میری نگاہ اللہ کی طرح لاگ لگاؤ سے پاک ہو جائے۔ میں اللہ نہیں ہوں۔ بندہ ہوں۔ یہی لاگ لگاؤ میری پہچان ہے۔ میری میں ہے۔

میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں اس میں میری نگاہ شامل ہوتی ہے۔ جو مجھے نظر آتا ہے وہ لکھتا ہوں۔

میں نے کبھی حتمی سچائی پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔

میں تو اپنا سچ لکھتا ہوں۔ اور اپنے سچ میں میں نے کبھی ڈنڈی نہیں ماری۔ یہ لوگ جن پر میں نے لکھا ہے یہ سب بڑے لوگ ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے جذبہ احترام ہے۔

میرا ایمان ہے کہ آپ کو صرف اس شخصیت پر لکھنے کا حق حاصل ہے جس کے لیے آپ کے دل میں جذبہ احترام ہے۔

انسانی شخصیت ایک تہہ در تہہ ڈھکا چھپا سلسلہ ہے۔ پورے طور پر اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میں نے شخصیت کے کسی نمایاں وصف پر بات کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

بہر صورت ایک بات نہ بھولیے گا کہ شخصیت کو حتمی طور پر جاننے کا میں دعویٰ نہیں کرتا۔ اور جو کچھ پیش کر رہا ہوں وہ ''میرا سچ'' ہے۔ میں نے ابتدا میں تین مضامین اپنی شخصیت پر بھی شامل کر لیے ہیں۔ ایک جانے پہچانے نقاد کا' دو اپنے قریبی ساتھیوں کے۔ ایک مثبت' ایک منفی' تاکہ تصویر کے دونوں رخ پیش کر دیئے جائیں۔ اس مجموعے میں میں نے سترہ شخصیتیں پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ آخر میں چھ پھلجھڑیاں ہیں جن میں شخصیت کم کم ہے' کہانی زیادہ۔

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید

مہا اوکھا

ممتاز مفتی بھی خوب آدمی ہیں۔ بھری مجلس میں اپنی نفی اس طرح کرتے ہیں کہ سننے والوں کا جی بھی کر آتا ہے کہ انہیں غیر اہم سمجھیں۔لیکن جب ان کے افسانے پڑھیں' سفرنامے پڑھیں' خاکے پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی انسان ہیں۔ اتنے غیر معمولی کہ ان کی ہر بات کو ان کی شخصیت کا وہ رخ قرار دینا ضروری ہو جاتا ہے جو ان میں موجود ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ''مجھے افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ نہیں۔'' لیکن اب تک اتنے افسانے لکھ چکے ہیں کہ ان کی عمر عزیز کے برسوں کی تعداد بھی پیچھے رہ گئی ہے اور ''مفتیانے'' جو ان کے افسانوں کی کلیات ہے اتنی ضخیم کتاب ہے کہ آپ اسے آلہ ضرب کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مفتی صاحب کہتے ہیں۔ ''مجھے شخصیت نگار ہونے کا زعم نہیں ہے۔'' لیکن وہ شخصیت کی پیاز کو اس فنکاری سے چھیلتے ہیں کہ پیاز ختم ہو جاتا ہے لیکن شخصیت مفتی صاحب کی مٹھی سے ہرگز نہیں نکلتی۔ وہ اسے چمکاتے چلے جاتے ہیں۔ چند سال قبل ایک کتاب ''اوکھے لوگ'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ اب اس کا ترمیم شدہ ایڈیشن ''اور اوکھے لوگ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ پہلی کتاب میں شخصیات کی تعداد صرف بارہ تھی اب یہ تعداد چوبیس ہو گئی ہے۔ اب ان خاکوں کو پڑھ کر مفتی صاحب سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر شخصیت نگار آپ جیسا نہیں ہوتا تو وہ کیسا ہوتا ہے؟

ممتاز مفتی صاحب سے اس قسم کا سوال کریں تو وہ بحث میں نہیں پڑتے۔ کسی قسم کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ مفتی صاحب اردو دنیا کے ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جو بحث کو محبت کی نہیں ادب کی قینچی شمار کرتے ہیں۔ لمبی بحث کرنے والے نقادوں کو ہر وقت تخلیق کاری کی طرف مائل کرتے رہتے ہیں۔ سوال سامنے آجائے تو اپنی ڈھال خود بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''میرا علم خام ہے۔''

''میں صاحب نظر بھی نہیں ہوں۔''

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جب بھی لکھتے ہیں' علم خامہ سے لکھتے ہیں اور صاحب نظر ایسے ہیں کہ کوئی شخص بھی ان سے اپنا باطن اوجھل نہیں رکھ سکتا۔ ان کی نظر جسم کے آر پار چلی جاتی ہے۔ ہڈیاں اور انتڑیاں عبور کر جاتی ہیں۔ جسم کی کھال ان کی نظر کے

سامنے رکاوٹ نہیں بنتی۔ایک دن بانو قدسیہ کی داستان سرائے میں ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے صوفے پر بٹھا دیا خود زمین پر بیٹھ گئے' تکیہ اٹھا کر گود میں رکھ لیا میرا ہاتھ دیکھے بغیر بولے۔''انور سدید! تو بڑی صلاحیتوں کا مالک ہے۔''

ممتاز مفتی جیسے بڑے ادیب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔میں سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے صوفے پر کیوں بٹھایا' خود فرش پر کیوں بیٹھے۔اب میں ان کی زبان سے دوسرا تعریفی جملہ سننے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔عظیم ادیبوں کا طریق یہی ہے کہ خوردوں کو بڑا ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔دولے شاہ کے چوہے کے سر پر لوہے کا کلاہ زرتار پہنا دیتے ہیں۔ لیکن جب بانو قدسیہ نے اندر سے تاندلیانوالہ کے دیسی گھی میں تر بہ تر پراٹھا بھجوایا تو مفتی صاحب بولے۔''تم میں کمزوری صرف ایک ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ صاحب علم اب اپنی عارفانہ حیثیت میں کلام کر رہے ہیں۔ مجھے آسمان سے زمین پر اتار رہے ہیں۔میں نے چوکنا ہو کر کہا۔''مفتی صاحب' اپنی کمزوری ہی تو دریافت کرنا چاہتا ہوں۔مرشد! ارشاد فرمایئے۔''

بولے۔''وزیر آغا۔۔۔۔۔۔۔۔۔وزیر آغا تمہاری کمزوری ہے۔''

میں تھوڑا اسٹپٹایا۔مفتی صاحب کی نفسیات دانی متزلزل ہونے لگی۔میں جسے اپنی شہ زوری سمجھ رہا تھا' مفتی صاحب اسے کمزوری شمار کر رہے تھے۔کتنی عجیب بات تھی' تب مجھے مشفق خواجہ یاد آئے۔انہوں نے قدرت اللہ شہاب کے بارے میں لکھا تھا۔''قدرت اللہ شہاب بڑی خوبیوں کے مالک تھے' عیب صرف دو تھے۔اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔''

ممتاز مفتی نے بھانپ لیا کہ میں تذبذب میں پڑ گیا ہوں۔فوراً بولے''تمہیں شکر گزاری کا عارضہ لاحق ہے۔میں خود اس بیماری کا گزشتہ تیس برس سے شکار رہا ہوں۔شکر گزاری کے جذبے کے تحت میں قدرت اللہ شہاب کو جھنڈے پر چڑھاتا رہا ہوں۔تم بھی وزیر آغا کو سہارا دے رہے ہو۔آغا تو سہارے کا محتاج نہیں۔''

ممتاز مفتی اندر کی باتیں بنا رہے تھے۔میرے اندر کی نہیں' اپنے اندر کی۔اچانک بولے''جتنا نقصان میں نے قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کو پہنچایا ہے اور کسی نے نہیں پہنچایا۔''

ان کی آخری بات نے میرے اندر بھی کہرام بپا کر دیا۔کیا میں بھی وزیر آغا کو نقصان پہنچا رہا ہوں اور میرے خلوص کی قیمت کیا ہے۔''نقصان دوستاں یا شماتت ہمسایہ؟''

ممتاز مفتی سے ملاقات ختم ہوگئی۔میں تشکیک کو گرہ میں باندھ کر گھر لے آیا اور یہ گرہ طویل عرصے تک نہیں کھلی۔لیکن ممتاز مفتی کی

نئی کتاب ''اوراوکھے لوگ'' آئی تو یہ گرہ کھل گئی۔انہوں نے متعدد ناموراور ممتاز شخصیات کی گرہیں عین چوراہے میں کھول دی تھیں۔ بشریٰ رحمٰن کی گرہ کشائی میں لکا تھا ''خودنمائی سے بھرپور بازی گر'' ۔۔۔۔۔۔۔۔ مسعود قریشی کے بارے میں رائے تھی ''زودحسی سے بھی بھن بھن کرتا بے ڈنک بھڑ'' ۔۔۔۔۔۔۔۔ سنا ہے بعض لوگوں نے ممتاز مفتی کے ان ارشادات کو کاتب سے جلی قلم سے لکھوا کر طغرہ دیوار بنالیا ہے کہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ہر ایک کی نظر پڑے۔انور سدید کے بارے میں خیال تھا کہ ''اوکھے دوجوں کے لیے بھی اپنے لیے بھی'' ۔۔۔۔۔۔۔۔ ثاقبہ رحیم الدین کے بارے میں فیصلہ یہ تھا ''اکیلا ویران سنگلاخ جزیرہ'' ۔۔۔۔۔۔۔۔ پرتو رہیلہ واحد ادیب نظر آیا جسے ممتاز مفتی نے ''ان جانی' ان مانی حقیقتوں'' کا مصور قرار دیا۔

واضح رہے کہ ''اوراوکھے لوگ'' میں ہر دو اصناف کے ادیبوں کے خاکے ہیں۔مردوں کے خاکوں میں ممتاز مفتی نے چابک ہاتھ میں لے رکھا ہے لیکن وہ درے مارنے کی بجائے چابک سے شخصیت پر پڑی ہوئی گرد اتارتے نظر آتے ہیں۔خواتین کے خاکوں میں ممتاز مفتی کا قلم گلاب کا پھول بن جاتا ہے۔وہ خاکہ نہیں لکھتے بس پھول کو سونگھتے ہیں اور خاکے میں انوکھی خوشبوانڈیلتے چلے جاتے ہیں۔ثاقبہ رحیم الدین کے خاکے سے چنبیلی کی خوشبو کی لپٹیں اٹھتی ہیں۔بانو قدسیہ کے خاکے میں دیسی گھی کی خوشبو ہے جو راہ چلتوں کا راستہ روک لیتی ہے۔پروین عاطف کا خاکہ تو بالکل سورج مکھی کا پھول ہے اور بشریٰ رحمٰن وہ گلاب ہے جو محوِ خودنمائی ہے لیکن خوشبو ساری اس کے اندر جذب ہورہی ہے۔مفتی صاحب نے اسے ''ہر رنگ رنگی'' کہا ہے' شاید ٹھیک ہی کہا ہے۔

''اوراوکھے لوگوں'' میں ایک ''اوکھا لوگ'' خود ممتاز مفتی ہے۔اپنا خاکہ لکھنا بہت مشکل کام ہے لیکن مفتی صاحب کو چونکہ نفی ذات کا پیدائشی عارضہ لگا ہوا ہے اور شریف کہلانے کا انہیں کبھی شوق نہیں ہوا۔اس لیے وہ اس مشکل منزل سے بھی کامیاب وکامران گزرے ہیں۔اس خاکے کو پڑھتے وقت بس اتنی احتیاط ضروری ہے کہ اثبات کو نفی سمجھیں اور نفی کو اثبات تصور کریں اور اگر کہیں یہ دونوں آپس میں گڈمڈ ہوجائیں تو چنداں پریشان نہ ہوں۔

مفتی صاحب اب چوراسی برس کے ہوگئے ہیں۔ہمارے سینئر ترین ادیب ہیں۔لیکن وہ دنیا کے سودوزیاں سے بے نیاز ہیں۔ اندر کا گندا مواد پیشاب کے راستے خارج کرنے کے لیے ایک نلکی جسم کے ساتھ مستقل لگا رکھی ہے لیکن قہقہہ کھل کر اور زور سے لگاتے ہیں' خواہ نلکی نکل کر باہر جا پڑے۔جب جی چاہتا ہے سیر کرتے کرتے ہسپتال چلے جاتے ہیں۔ڈاکٹروں اور نرسوں سے اکتا جائیں تو ہسپتال کو اٹھا کر گھر لے آتے ہیں۔اپنی بیماری سے محبت کرنے لگتے ہیں۔مفتی صاحب بیماری سے الرجک نہیں' بیماری خود ان سے الرجک ہے۔وہ تو انہیں چھوڑنے کی کوشش کرتی ہے لیکن مفتی صاحب چھوڑتے ہی نہیں۔اس سے کھٹ مٹھی محبت کرتے جارہے

ہیں۔ان کی بیماری کہتی ہے مفتی صاحب اس دور کے سب سے اوکھے آدمی ہیں میری جان ہی نہیں چھوڑتے۔میں وہ چتر کار عورت ہوں جو مفتی صاحب کی کمزوری ہے۔

◆◆◆

اشفاق احمد

سوا لاکھ کا ہاتھی

مفتی پر کچھ لکھتے وقت دراصل مجھے دو مشکلوں کا سامنا ہے۔ ایک تو یہ کہ میں نے کبھی کسی کا خاکہ نہیں لکھا۔ خاکہ اڑایا ضرور ہے مگر لکھنے کے معاملے میں ناآشنائے محض ہوں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ ادب کے ناقدوں نے ہر صنف ادب کے بارے میں کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور آپ اس لیگل فریم ورک سے باہر نہیں جا سکتے۔ خاکہ نگار کے لیے یہ پابندی عائد ہے کہ خاکہ لکھتے وقت خاکہ نگار اپنی خاکوانی کی مکمل مدح سرائی نہیں کر سکتا اور اس کو ایک اچھے اعلیٰ اور معیاری شخص کے طور پر پیش نہیں کر سکتا۔ اس کی شخصیت میں تھوڑی بہت برائی ضرور شامل کرنی پڑے گی خواہ وہ مانگے کی برائی ہی کیوں نہ ہو۔ کسی شخص کو پورے کا پورا بدمعاش، عیار، بے ایمان اور ظالم پیش کرنے کی البتہ پوری آزادی ہے۔ ابتدائے ایام میں میں نے دو دوستوں کے تین خاکے لکھے تھے لیکن ایڈیٹر نے انہیں اس وجہ سے ناقابل اشاعت قرار دے کر واپس بھیج دیا کہ ان میں ساری اچھی اچھی باتیں ہی تھیں اور اچھی اچھی باتیں پڑھ کر قارئین کے بے مزا ہونے کا اندیشہ تھا۔ ساتھ ہی اس سے میری شہرت کو گزند پہنچنے کا احتمال بھی تھا اس لیے ان کی اشاعت روک دی گئی۔

دوسری پابندی خاکہ نویس پر یہ لگائی گئی ہے کہ وہ خاکوانی کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنا ذکر بالکل نہ کرے اور یہ ہرگز ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ خاکوانی کو جانتا ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس پر یہ حد قائم ہو جائے گی کہ اس نے اپنے ممدوح کی شہرت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر خود کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے اور ممدوح کو بطور ایک لیور کے استعمال کیا ہے۔ یہ دوسری پابندی جو سراسر گھاٹے کا سودا ہے، میں پھر بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں لیکن پہلی پابندی کے ساتھ میری مصالحت ذرا مشکل ہے۔ میں پیر پرست اور لیڈر قسم کا انسان ہوں جس کی محبت میں ڈوبا پورے کا پورا ڈوبا۔ جب بیزاری پیدا ہوئی تو ٹوپی سوٹی لے کر باہر نکل گیا۔ یہ مجھ سے نہیں ہوتا کہ ہاں اچھے بھی ہیں اور انسانی کمزوریاں سے پر بھی ہیں۔ لمبے ہیں اور گھٹے بھی۔ راست گو ہیں پھر بھی دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ رنگت گوری ہے لیکن جلد کالی ہے۔ بابو گوپی ناتھ بھی ہیں کالو بھنگی بھی۔ معافی چاہتا ہوں مجھ سے گرے پینٹ نہیں ہوتا۔

ممتاز مفتی ایک ایسا ہمدرد، محبتی، انسان دوست اور خدائی خدمت گار قسم کا انسان ہے کہ بال آخر آدمی اس کی محبت سے تنگ آ کر

بھاگ جاتا ہے ظالم زمانے کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور وہاں بیٹھ کر مفتی پر روڑے پھینکتا ہے جن میں سے کوئی بھی اس کو نہیں لگتا۔ وہ ان روڑوں کو جمع کر کے اپنے رویے کی کرم پیک سے ایسا عرق چتال جنتر کرتا ہے کہ جو اس روڑا پھینکنے والے کو دن میں تین مرتبہ پینا پڑتا ہے اور عمر کے آخری حصے تک اس عرق کے سہارے جینا پڑتا ہے۔ آپ اس کے دوست رہیں دشمن بن جائیں تعلق رکھیں تعلق توڑلیں زندہ رہیں فوت ہو جائیں ممتاز مفتی آپ کے آس پاس ہی رہتا ہے۔ اصل میں مفتی کے لیے ہر موجود اور ناموجود ایک معجزہ ہے اور اس کے نزدیک ناموجود موجود سے قوی تر ہے اور معجزہ حقیقت سے زیادہ پائیدار اور قابل اعتماد ہے اور نامعلوم اور ناشناخت کا علم معلوم کے علم سے وسیع تر اور درخشندہ تر ہے۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ ایسی سوچ والے انسان کے ساتھ آپ کہاں تک چل سکتے ہیں اور ایسی سوچ کا انسان آپ کو بیچ منجدھار میں چھوڑ بھی کیسے سکتا ہے۔ ممتاز مفتی سے دوستی تو آسانی کے ساتھ لگائی جا سکتی ہے لیکن اس کو نبھانا بہت مشکل ہے کہ یہ روایت کا بندہ نہیں بندھی ٹکی ریتوں کو نہیں مانتا۔ پر لوک ریت کے گھروندے میں رہتا ہے اور تحکمات کے آگے دست بستہ کھڑا ہے۔ مجھ پر اور میرے بال بچوں اور میرے گھرانے پر ممتاز مفتی کے بڑے احسان ہیں۔ ہم زندگی کے کسی بھی چلن میں بے راہ ہوئے یہ بھاگ کر ہمارے لیے ٹیکسی لے آیا۔ ہم نے بھولے سے کبھی کوئی بھلائی کا راستہ اختیار کیا مفتی کھڑانویں پہن کر منڈل ہاتھ میں لے ہمارے ساتھ چل پڑا کہ راستے میں بچوں کو کسی چیز کی ضرورت ہوگی اور بچوں کے باپ کو چلنے میں دقت ہوگی تو باپ کے لیے تو دری بچھا دوں گا اور بچوں کو قریب سے ناشتہ کرا کے لے آؤں گا۔ رہی بانو قدسیہ تو اس کو اڑتی چڑیا کے پر گن کر بتلا دوں گا کہ ایک طرف تیرہ ہیں اور دوسرے طرف اکیس اور یہی وجہ ہے کہ اڑتی ہوئی چڑیا جھپ کھاتی ہے اور جب جھپ کھاتی ہے تو شکرے کی پکڑ میں آجاتی ہے اور جب شکرے کی گرفت میں آجاتی ہے تو بانو قدسیہ اس پر ڈرامہ لکھتی ہے اور جب اخبار چھپتا ہے تو اس میں آدھے صفحے کا مضمون ہوتا ہے۔

Morbid World of Bano Qudsia

اس مضمون کو پڑھ کر مفتی پہلے ہنستا اور پھر روتا ہے۔ ہنستا اس لیے ہے کہ جاہل تمثیل نگاروں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے اور روتا اس لیے ہے کہ جاہل نقاد کو اصل بات سمجھ میں نہیں آئی اور وہ کم خواب کے اس ٹکڑے کو لاٹھی کے گز سے ناپ گیا۔

مفتی کو اپنے ملک کی ہر حکومت سے بے پناہ محبت ہے اور وہ اس کی صحت اور سلامتی کی طویل دعائیں مانگا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حکومت کو پسند کرنے کی وجہ صرف ایک ہے کہ ہر پاکستانی حکومت ہر ملک اور ہر مقام پر اور ہر ادارے سے بلا استثنا قرض لیتی ہے اور دبا کے لیتی ہے اور بڑی شریفانہ زندگی بسر کرتی ہے۔ اپنی قرضہ لینے والی حکومتوں سے متاثر ہو کر اس نے ایک انوکھا

فارمولا وضع کر رکھا ہے جس پر وہ شاید خود تو گامزن نہیں لیکن دوسروں کو اس پر عمل کرتے دیکھنے کا دل سے متمنی ہے۔ مفتی کی ہم سب کو ایک ہی نصیحت ہے کہ ہمیشہ اپنی آمدنی کے اندر رہ کر زندگی بسر کرو خواہ مخواہ اس کے لیے تم کو قرض لے کر ہی ایسا کیوں نہ کرنا پڑے۔

اگر آپ کو کبھی اس کی خوابگاہ میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ مفتی کے پلنگ کے نیچے طرح طرح کے ڈبے صندوقچیاں سوٹ کیس' اٹاچی اور ڈھکنے والی ٹوکریاں انتہائی بدنظمی کی حالت میں بڑے سلیقے کے ساتھ رکھی ہوتی ہیں۔ آپ سے باتیں کرتے کرتے وہ اپنے پلنگ پر لیٹا لیٹا' ادھ کھلے چاقو کی طرح پلنگ کے نیچے اس طرح چلا جائے گا کہ چاقو کا دستہ بستر پر رہے گا اور پھل نیچے اتر کر پھرولا پھرولی شروع کر دے گا۔ آپ دستے سے باتیں کر رہے ہیں اور دستہ باقاعدگی سے جواب بھی دے رہا ہے لیکن نیچے کی تحقیق گہرے انہماک سے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ دس پندرہ منٹ کی کدوکاوش کے بعد وہ مطلوبہ چیز نکال کر آپ کے سامنے پیش کر دے گا اور چاقو بستر پر بند ہو کر اوپر کمبل کھینچ لے گا۔ مطلوبہ چیزوں میں عام طور پر آپ کے بچوں کے لیے میٹھی گولیاں' آپ کی بیوی کے ٹوٹے ہوئے ناخن کے لیے نیل کٹر' آپ کے ملازم کے لیے عطر حنا کی پرانی شیشی کا کارک اور خود آپ کے لیے وہ چٹھی ہوتی ہے جو آپ نے قیام پاکستان سے تین سال قبل بھٹنڈہ کے ریلوے اسٹیشن سے اسے قصور کے پتہ پر لکھی تھی اور جس پر جارج ششم کی ایک پیسہ کم وہ ٹکٹ لگی تھی جس نے اس چٹھی کو دو پیسے کا بیرنگ کر دیا تھا۔ اس خط میں آپ نے وہ جھک ماری تھی کہ اگر آپ کے بیٹوں پوتوں کو اب پتہ چل جائے تو وہ آپ کو سفید بالوں سمیت گھر سے نکال دیں اور اپنے نان ونفقہ سے عاق کر دیں۔ اب چٹھی آپ کے ہاتھ میں ہے اور چاقو دوسری طرف منہ کر کے لیٹا ہوا ہے۔ کاغذ پر آپ کی تحریر موجود ہے اور چٹھی کی ہیئت ہے کہ نہ توڑنی نہ مروڑنی نہ پھینکنی نہ چھپانی نہ سوختنی نہ فروختنی۔

مفتی کے مرد دوستوں اور خواتین دوستوں کے اپنے اپنے الگ تجربات ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے سے الگ اور مختلف النوع نتائج اخذ کر رکھے ہیں۔ عورتیں مفتی جی کو ایک محبوب صفت' اکھڑ' منہ پھٹ' پلپلا اور جھینپو فادر فگر سمجھتی ہیں۔ مرد انہیں بانکا' چھبیلا' دل باز پرگو' غم ساز' دردمند' شفیق اور محبتی اماں وڈھی سمجھتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اس بڑے قالب میں تاروں کی چھاؤں تلے' آسمانوں کے فرشتے اماں وڈھی اور فادر فگر کا نکاح پڑھا چکے ہیں اور دونوں بابا بابی ممتاز مفتی کے وجود کو سوئس کاٹیج میں بڑی پرامن زندگی گزار رہے ہیں۔

محبت کرنے والے لوگوں کی زندگی کے کئی پہلو بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور ان کی Magnetic فیلڈ میں آجانے سے بڑے زور کا دھاکہ ہوتا ہے لیکن ہماری اماں وڈھی کی محبتی زندگی کا صرف ایک پہلو ہی خطرناک ہے۔ اگر اس میں سے آپ سجاؤ کے

ساتھ گزر گئے تو پھر ساتوں خیریں ہیں اور اگر یہاں رک گئے تو پھر اتنے زور کا دھماکہ ہوگا کہ آپ کی نظروں کے سامنے آپ کے چیتھڑے اڑ جائیں گے اور کمیٹی کے پرانے کاغذوں میں صرف آپ کا نام ہی رہ جائے گا۔ اگر آپ پہلی مرتبہ مفتی جی سے ملنے جا رہے ہیں تو آپ کو اپنے ساتھ کوئی جسمانی عارضہ لے کر جانا ہوگا اور اگر آپ آخری مرتبہ ان سے سرو ڈھنواں بیر لے کر لوٹ رہے ہیں تو بھی آپ کو اپنی بیماری کے لیے ان سے ہومیو پیتھک کی پڑیا لے کے لوٹنا ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ مفتی جی سے مل کر آرہے ہیں اور آپ کی جیب میں ہومیو پیتھک گولیوں کی شیشی نہیں ہے۔ مسعود' عمر' عماد اور اعظمی کی مفتی سے چالیس سالہ پرانی دوستی ہے اور سب نے مفتی کی خوشنودی کے لیے کوئی نہ کوئی بیماری پال رکھی ہے جس کی تفصیل جاتے ہی بیان کرنا مفتی سے محبت کے قرینوں کا پہلا قرینہ ہے۔

مسعود چونکہ ہم سے زیادہ ذہین' تیز فہم اور پیش بین ہے اس لیے وہ گھر سے ہی کوئی بیماری سوچ کر چلتا ہے۔ عمر بے حد سادہ لوح' معصوم اور گھامڑ ہے اس لیے اس کو مفتی کے دروازے پر پہنچ کر یاد آتا ہے کہ اس کے پاس تو پیشکش کے قابل کوئی بیماری ہی نہیں۔ اس لیے گھنٹی بجانے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ پھر وہ ہم سب کی منتیں کرتا ہے' واسطے ڈالتا ہے اور دروازے کے سامنے بازو تان کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ جب تک مجھے کوئی بیماری نہیں کرو گے اور اسے مجھے نہیں سمجھاؤ گے' میں تم کو اندر جانے نہیں دوں گا۔ مسعود کہتا ہے ''یار تم اس سے کہہ دینا کہ پیشاب رک رک کر آتا ہے' جلن بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی ٹیس بھی اٹھتی ہے۔'' عمر پریشان ہوتا ہے کہ اگر اس نے پوچھ لیا ٹیس کس قسم کی ہوتی ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔ مجھے تو کبھی ٹیس اٹھی ہی نہیں۔ اعظمی کہتا ہے کہ شرم کرو یار۔ کیا جاتے ہی بول و براز کی باتیں شروع کر دو گے۔ اچھا لگے گا بھلا؟ دیکھو عمر تم اس سے کوئی سادہ سی بات کر دینا کوئی سیدھی سی بیماری۔ عماد کہتا ہے ''سیدھی سی بیماری سے وہ ناراض ہو جائے گا اور اس کو جوتے مار کر نکال دے گا۔ تم یہ رک رک کر آنے والے پیشاب کا ہی ذکر کرنا۔'' اعظمی کہتا ہے ''کان کی تکلیف' بھائی کان کی۔'' اور مسعود آگے بڑھ کر گھنٹی بجا دیتا ہے۔ سب دوستوں کو اس طرح ایک ساتھ باجماعت آتے دیکھ کر مفتی کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور وہ سب کے لیے پان لگانے بیٹھ جاتا ہے۔ مسعود اپنی بیماری کی تفصیلات پیش کرتا ہے اور اس کو دوائی دینے کا وعدہ ہو جاتا ہے۔ عماد اپنے عارضے میں بڑھوتری کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کو بتایا جاتا ہے کہ ابھی تین دن تک وہی دوائی کھاؤ۔ اعظمی عینک اتار کر اپنی آنکھیں دکھاتا ہے۔ مفتی کہتا ہے پان لگا کر روشنی میں دیکھوں گا۔ اب عمر کے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں اور خوف سے رعشہ طاری ہے۔ ہکلا کر کہتا ہے۔ ''مفتی میرے کان میں ------- -------جانب ہوتی ہے اسی طرح بہترین بیوی' بہترین نوکری' بہترین گھر' بہترین اپر چونٹی ہمیشہ اپنے سے مخالف سمت میں

ہوتی ہے۔ واہ جی واہ۔ عکسی اس کی ایسی باتوں سے بہت چڑتا ہے اور گھبرا کر کہتا ہے۔ ''بس کرا بوُ بولے نہ جا۔'' میں بھی ایسی باتوں سے بہت چڑتا ہوں لیکن صرف اندر سے اور چونکہ میں اس کو ''بس کر مفتی' بولے نہ جا'' نہیں کہتا اس لیے یہ مجھ سے ناراض سا رہتا ہے۔

مفتی دراصل حزب اقتدار کا آدمی ہے۔ ننگ پھانک' بے سر و سامان' بے ملک و بے ثروت ہونے کے باوجود ہر قسم کی حزب مخالف کو دعوت کلوخ زنی دیتا رہتا ہے۔ جب تک کوئی مفتی کو طعنہ نہ دے' چونڈی نہ کاٹے' شاٹ نہ مارے' دھکا نہ دے یہ مضمحل اور بیمار بیمار سا رہتا ہے اسی لیے اس کے سارے دوست اور جگری یار نہ ماننے والے لوگ ہیں۔ جس دن آپ بدقسمتی سے اس کے ہم خیال اور ہم فکر ہو گئے۔ یہ سالم ٹیکسی لے کر خود آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آئے گا اور تیسرے دن سارے دوستوں کو اپنے گھر سوئم پر جمع کر کے آپ کی آخری فاتحہ کر دے گا۔ مجھ پر اس نے نو مرتبہ فاتحہ کیا اور ایک مرتبہ میرے چہلم کا اہتمام بھی کیا لیکن میں اس کے حزب مخالف میں شامل ہو کر پھر اس کا گہرا دوست بن گیا۔ اکثر کہا کرتا ہے کہ میری زندگی کے پہلے پنتالیس سال بڑی بے کیفی اور بے لذتی میں گزرے اور میں نے یہ سارا عرصہ مایوسی' خواری' پریشانی اور دردمندی میں گزارا۔ پھر خدا کے فضل و کرم سے' پاکستان بننے کے چند سال پہلے' رجعت پسند کی ترکیب وضع ہوئی اور میرے سوکھے دھانوں پر پانی پھرا۔ مجھے زندہ رہنے اور زندگی کرنے کا ایک سہارا ملا اور میری صحت اچھی ہونے لگی۔ اب جب سے فنڈا منٹلسٹ کا لفظ ایجاد ہو کر آیا ہے' مفتی پہلے سے زیادہ صحت منداور چاق و چوبند ہو گیا ہے۔ ملا لوگوں کے اسی طعن و تشنیع اور چونڈی دندی نے ممتاز مفتی کو ایک عامل کامل صوفی بنا دیا ہے۔ وہ کسی ورد' وظیفے' نماز' روزے یا ذکر و اذکار سے اس مقام پر نہیں پہنچا۔ ملامتوں کا ٹکٹ سجا کر اہل صفا میں جا بیٹھا ہے۔

کوئٹہ سے ایک باریش اور باشرع صوفی جب پنڈی اسلام آباد آئے تو انہوں نے مہینہ ڈیڑھ مہینہ مختلف حلقہ ہائے صوفیاں کا جائزہ لینے کے بعد ممتاز مفتی کو پنڈی اسلام آباد کا پیر طریقت مقرر کر دیا اور ہم سب پر اس کی اطاعت لازم کر دی۔ یہ ایک ایسا تکلیف دہ اور غیر انسانی حکم تھا کہ مفتی نے ہمارے ساتھ مل کر اور ہمیں ورغلا بھڑکا کر اس حکم کے خلاف رٹ کرا دی۔ تھوڑے عرصے بعد پنڈی اور اسلام آباد کے وہ گروہ بھی ہمارے ساتھ آ کر شامل ہو گئے جن کا قلبی' نسبی اور خاندانی طور پر اس گدی پر ازلی حق بنتا تھا۔ ادھر کوئٹہ کے پیر صاحب نے کوئٹہ پہنچ کر دوسرا ستم یہ کیا کہ اعلیٰ درجے کا ایرانی جاءنماز اور سنگ چانی کی ایک مرصع تسبیح ممتاز مفتی کو بھجوا دی۔ مفتی یہ تحفے پا کر بہت خوش ہوا اور پیر صاحب کو بذریعہ ایکسپریس تار پیغام بھجوایا کہ جاءنماز مل گئی' توجہ کا شکریہ۔ اب مہربانی فرما کر ایک نماز بھی بھجوا دیں تاکہ جاءنماز استعمال ہو سکے۔ انہوں نے بذریعہ جوابی تار مفتی صاحب سے ان کا عہدہ اور ولایت واپس لے لی اور

مفتی نفسی خوشی لوٹ کے ہمارے درمیان آ گیا۔ ایسے خطرات سے یہ کئی مرتبہ بڑے حسن اور سلیقے کے ساتھ برآمد ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

ممتاز مفتی اس عالم ناسوت میں احترام صرف عکسی مفتی کا کرتا ہے اور محبت قدرت اللہ شہاب سے۔ میں اس کے نقطہ احترام سے تو اختلاف نہیں کرتا البتہ مرکز محبت پر نکتہ چینی ضرور کرتا ہوں۔ قدرت اللہ شہاب ہمارے بھی دوستوں میں سے تھے لیکن ممتاز مفتی نے ان کو ایسے مقام پر لا بٹھایا ہے کہ اب ان کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہم سب کی ٹوپیاں گرنے لگی ہیں۔ اپنی دستار فضیلت سب کے سامنے گرتے ہوئے دیکھ کر کس کو تکلیف نہ ہوگی بھلا۔ لیکن یہ ہماری تکلیف سے بے پرواہ اور ہمارے احساس کمتری سے بے نیاز ایک ہی دھن الاپے جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی رخنہ اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔ شہاب اپنے سارے قریبی دوستوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوا لیکن ہم سمجھدار لوگ تھے اور اپنے نفع و نقصان کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ہم جب بھی اس کے قریب گئے زرہ بکتر پہن کر گئے۔ مفتی اس معاملے میں بالکل بھولا اور احمق انسان نکلا۔ وہ ململ کا کرتہ پہن کر اس کے پاس چلا گیا اور لمبی باتوں میں مصروف ہو گیا۔ لمبی باتیں اور گفتگو کے لہرے انجمنوں، محفلوں اور اسمبلیوں میں تو بڑا مزا دیتے ہیں لیکن کسی مرد خدا مست کی حضوری میں خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مفتی کو یہ علم نہ تھا کہ گرو سدھی موت ہوتا ہے۔ جو کوئی بھی تسلیم کی وادی سے گزر کر مرشد کی طرف جاتا ہے وہ موت کی طرف بڑھتا ہے۔ ایسی گہری گھناؤنی اور بھسم کر دینے والی موت کی طرف کہ اس کے بعد کچھ بچتا ہی نہیں۔ دوسری موت میں تو جسم مرجاتا ہے، شریر فنا ہو جاتا ہے لیکن شعور باقی رہتا ہے اور آگے چلا جاتا ہے لیکن گرو کے مارے ہوئے کا سب کچھ فنا ہو جاتا ہے، سب بھسم ہو جاتا ہے۔ اس میں شریر باقی رہتا ہے نہ شعور۔ کلہم فنا ہو جاتا ہے بس ایک لافانی عنصر باقی رہ جاتا ہے جو اصل ہے، حقیقت ہے۔ جو ہے اور کہ نہ ہے۔ مفتی اپنی اس شیخی میں ایلا گہلا، بے فکرا، لا ابالی انداز میں ململ کا کرتہ پہن کر شہاب کے سامنے چلا گیا اور اپنی چرب زبانی کا چلہ کھینچ کر اس کے سامنے ڈٹ گیا۔ لیکن یہ بابے لوگ بڑے چالاک اور ایسے مسک میسنے ہوتے ہیں کہ دانش کے سارے راستے روک دیتے ہیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دانش اور عقل کی باتوں سے تو تم سمجھ ہی جاؤ گے کہ اس میدان میں تمہاری پریکٹس کافی پرانی ہے اور علم سے تو تم قائل ہو ہی جاؤ گے کہ تمہارے گھر کو صرف یہی ایک راستہ جاتا ہے لیکن علم سے قائل ہونا تمہارے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے گا۔ تم عقلی طور پر تو معقول ہو جاؤ گے لیکن اصلی طور پر نہیں، سمجھ تو جاؤ گے لیکن تبدیل نہ ہو سکو گے۔ ایسے میں ان کے پاس سیوا جی کا ایک چھپا ہوا فولادی پنجہ ہوتا ہے جو وہ بغل گیر ہوتے وقت ململ کرتے والے افضل خان کی کمر میں اتار کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈھیر کر دیتے ہیں۔ اس لیے ختم کر دیتے ہیں کہ علم اور معلوم کی جگہ لا معلوم

کا گیان حاصل ہو جائے۔ خرد کی جگہ دل زندہ ہو جائے اور پھر سے دھڑکنے کے قابل ہو جائے۔ تمہارا پھر اس سے تعارف ہو جائے۔ اپنے قریبی اور قریب ترین دوست سے جس کو تم نے ازل سے بھلا رکھا ہے اور بالکل فراموش کر دیا ہے۔

اب ہم سارے ساتھی پریشان ہیں اور اپنے محبوب دوست مفتی ''افضل خان'' کا لاشہ اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں جس کی کمر میں فولادی پنجہ اترا ہوا ہے اور جس کا زخم اب بھی تازہ ہے۔ نہ ہم اسے گورنر کے پھاٹک پر یا ایوان صدر کی سیڑھیوں پر لے جا کر احتجاج کر سکتے ہیں نہ اخباروں میں بیان دے کر اس خون ناحق پر کوئی تحریک چلا سکتے ہیں اور نہ ہی اسے نہلا دھلا کر دفن کر سکتے ہیں کہ خون ابھی تک رستا ہے اور بدن میں حدت باقی ہے۔ ہمارے لیے یہ ممتاز مفتی ہماری جانوں کا ایک عذاب بن گیا ہے۔ جب زندہ تھا تب بھی عذاب تھا اور اب جب فوت ہو چکا ہے تو اور بھی عذاب بن گیا ہے۔ ہم اس سوا لاکھ کے ہاتھی کو کہاں پھینکیں؟

◆◆◆

مسعود قریشی

کھیر پکائی جتن سے

ممتاز مفتی دنیائے ادب کا ''نوگزا'' ہے جو آج بھی اپنے گز گز بھر کے نقش قدم چھوڑتا محوخرام ہے۔ اس کی یہی حرکت ہم پانچ چھ فٹوں کو نہیں بھاتی۔ نوگزوں کو تو قبروں میں ہونا چاہیے' پھر ہم ان کا احترام کریں گے۔ ان کی قبروں پر پھول چڑھائیں گے۔ خیر چلو اگر زندہ بھی ہے تو گوشہ نشیں ہوجائے یا کم از کم نئے سے نئے شہکار لکھنا ہی چھوڑ دے۔ لیکن اس عمر میں جب بھی اس کے ہم عمر بیشتر ادیب اپنی سابقہ تخلیقات کی جگالی کرتے ہیں یہ نہ صرف انداز بلکہ موضوعات کے لحاظ سے بھی تازہ کار اور بوقلموں ہے۔

اگرچہ ممتاز حسین نوے برس کا ہوچلا ہے لیکن افسانہ نگار ممتاز مفتی ''بابوں'' سے عقیدت کے باوجود شوخ وشنگ فنکار ہے۔ وہ پھبتیاں کستا ہے' چٹکیاں لیتا ہے' چٹکیاں بجاتا ہے۔ جن جوانوں کی حرکتوں پر بزرگ لاحول پڑھتے ہیں ان کی ہمدردی سے عکاسی کرتا ہے۔ وہ آج بھی So What قسم کے نوجوانوں کی داستان معاشقہ پوری حقیقت پسندانہ جزئیات کے ساتھ لکھتا ہے۔ اسے بغیر سائیلنسر موٹر سائیکل چلانے والوں اور جین اور جیکٹ پہننے والوں میں بھی نازک جذبات اور خالص گہرے انسانی جذبات رکھنے والے انسان نظر آتے ہیں۔ خود بھی جانیوں سے سچ مچ کا عشق کرلیتا ہے تاکہ بیان میں محض مشاہدے کی تماش بینی کی بجائے تجربے کی سچائی شامل ہو۔ پھر اپنی عمر دیکھ کر اس حرکت پر ''حکم'' کا پردہ ڈال دیتا ہے۔

ممتاز مفتی کی ادبی تخلیقات کی بنیادی خصوصیت سچ ہے۔ لیکن یہ الہامی سچ کی طرح ازلی وابدی اور ہمیشہ کے لیے ایک ہی نہیں۔ یہ انسانی سچ ہے۔ متغیر' مختلف حالات میں مختلف۔ ایک دن ایک سادہ دل دوست نے ایک مقبول (ہر طرح سے مقبول) شاعر سے پوچھا کہ تمہارے نت نئے عشق مشہور ہیں' پھر عشق کی استواری اور خلوص وفا کا کیا ہوا جس کا دعویٰ تمہاری شاعری میں ہے۔ شاعر نے جواب دیا کہ میں نے بیک وقت ہمیشہ ایک ہی عشق کیا ہے اور اس عشق کے دورانیہ میں پوری طرح مخلص اور وفا شعار رہا ہوں۔ مفتی صاحب کے سچ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ عمر کے ہر دور میں جس سچ پر وہ یقین رکھتا ہے اس کے اظہار میں اس نے کبھی ریاکاری' مصلحت یا مصالحت سے کام نہیں لیا۔ اسے صدق ہنر کا اتنا احترام ہے کہ شروع شروع میں جب اس کا عریاں ادبی سچ روایتی معاشرے کے لیے قابل قبول نہیں تھا تو اس نے سچ میں ملاوٹ کرنے کی بجائے اپنے نام ''ممتاز حسین'' پر ''ممتاز مفتی'' کا پردہ ڈال

دیا۔طویل عرصے تک اس کے ساتھی اساتذہ اور شاگردوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کا استاد ممتاز حسین ''ممتاز مفتی'' کے نام سے کشت ادب میں کیا گل کھلا رہا ہے۔ادبی زندگی کے آغاز میں شہرت کتنی عزیز ہوتی ہے یہ ادیب ہی جانتے ہیں لیکن مفتی نے اپنی شہرت اور ادبی عزت سچ پر قربان کر دی۔

ممتاز مفتی انسان کے شعوری اور لاشعوری جذبات کے تضادات کا مصور ہے۔وہ ان تضادات سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتا ہے۔اس کے ہاں جہیز دینے کی توفیق نہ رکھنے والا باپ آدھی رات کو سیڑھی کے ذریعے گھر سے فرار ہونے والی بیٹی کی سیڑھی کو مضبوطی سے پکڑے رہتا ہے تاکہ کہیں سیڑھی کے کھڑکنے سے گھر میں کسی کی آنکھ نہ کھل جائے اور صبح کو اپنی بیوی کے ہمراہ اپنی نافرمان بیٹی کے فرار ہونے کی قبیح حرکت پر زار و قطار روتا ہے۔شادی شدہ زندگی کی یکسانیت سے تنگ آیا ہوا خاوند نیم شب کھڑکی کے راستے سے اپنے ہی بیڈ روم میں وزدانہ داخل ہو کر زندگی کے رومان کی تجدید کرتا ہے۔عقل پرست حاجی حج کے روایاتی پہلوؤں کا مذاق اڑا رہا ہے کہ بارش شروع ہو جاتی ہے اور عقل مجسم حاجی چھلانگ لگا کر میزاب رحمت (خانہ کعبہ کا پرنالہ) کے نیچے جا کر چھینٹے اڑاتا ہے۔

لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ان کمزوریوں اور ان تضادات کا شعور مفتی کو ایسے لوگوں سے نفرت یا حقارت پر مائل نہیں کرتا بلکہ اس کی بنا پر وہ اسے زیادہ عزیز ہو جاتے ہیں۔اسی لیے اس کے حلقہ احباب میں رنگین مزاج لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

ممتاز مفتی نے علم کے زور پر افسانے لکھنے شروع کئے۔نہ اسے زبان دانی کا دعویٰ تھا نہ تخلیق ادب کا۔اس کا سرمایہ انسانوں کا علم تھا۔ان کے شعور کا علم۔تحت الشعور کا علم۔اس علم کے بل بوتے پر اس نے افسانوں میں ایسے زندہ کردار تخلیق کئے جو افسانوں کے فریم سے نکل کر جیتے جاگتے لوگوں کی دنیا میں دھما چوکڑی مچانے لگے۔اگر آپ کے ڈرائنگ روم کی تصویر فریم کی چوکھٹ سے باہر نکل کر آپ کی محفل میں شریک ہو جائے تو آپ پر کیا بیتے گی؟ یہی کیفیت ممتاز مفتی کے قاریوں کی ہوتی ہے۔رسالے یا کتاب میں اس کا افسانہ پڑھ رہے ہوتے ہیں کہ کوئی آپا' کوئی ''اسمارا'' الفاظ کے حلقے سے نکل کر ان کی محفل میں شریک ہو جاتی ہے۔

افسانوں کے علاوہ مفتی نے رپورتاژ لکھے۔''لبیک'' ''ہند یاترا'' ۔۔۔۔۔۔۔۔ان میں مفتی کے مشاہدے کی گہرائی اور انداز بیاں کی دلکشی اپنے عروج پر تھی۔حقیقی دنیا کے حقیقی واقعات' مقامات اور کرداروں کی مصوری خیالی افسانوں سے مختلف اور مشکل ہوتی ہے۔یہ کام کامیابی سے ہو جائے تو اس کا تاثر زیادہ شدید' زیادہ گہرا ہوتا ہے۔''لبیک'' کا تو ایک ایک فقرہ لازوال علامتوں کا مظہر ہے۔

حج کے ارکان کی طرح' جو اشاریت اور رمزیت سے بھرپور ہیں۔اس میں قدرت اللہ شہاب بھی ایک علامت بن گیا ہے۔

ممتاز مفتی نے خاکے اور شخصیتیں بھی لکھی ہیں۔ ''پیاز کے چھلکے'' ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ''اوکھے لوگ'' ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ''اور اوکھے لوگ'' ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے ملنے والوں' اپنے دوستوں اور اپنے واقفوں کے خاکے لکھ رہا ہے۔ اس کے خاکوں میں یکسانیت کا عنصر ہے۔ شاید اسی یکسانیت کا نام انفرادیت یا انفرادی اسلوب ہے۔ لیکن ہر صورت میں ''ایک ہی یار'' دیکھنا صوفی کا معراج ہو تو ہو' ادیب کا نہیں۔ سبھی کردار پیاز کے چھلکے ہیں۔ سبھی اتھاہ گہرے' سبھوں کی شرافت کے غلاف میں سے سور تھوتھنی نکال لیتا ہے۔ انہیں منفرد بنانے کے شوق میں وہ سبھی کو ایک جیسے ''اوکھے'' بنا دیتا ہے۔ مفتی کہتا ہے کہ ان خاکوں میں یکسانیت کی وجہ یہی ہے کہ بنیادی فطرت بہت حد تک ایک سی ہوتی ہے۔

شخصیت نگاری میں مفتی کے کیمرے میں تصویر کشی کے لینز کی بجائے ایکسرے کا آلہ لگا ہے۔ لوگ رنگ برنگ کپڑے پہن کر اور میک اپ کر کے اس کے سامنے آتے ہیں لیکن اس کا کیمرہ ان کے جسم کی نہیں فطرت کی تصویر کھینچ لیتا ہے۔ چند کو یہ اپنے ظاہر سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ بہت سوں کو اپنی بگڑی صورت معلوم ہوتی ہے۔ مطمئن دونوں ہی نہیں ہوتے۔

ممتاز مفتی ایک کثیر الجہت ادیب ہے۔ افسانہ نگار تو خیر وہ ہے ہی اور اس نصف صدی کا اہم ترین افسانہ نگار لیکن اس نے ڈرامے بھی لکھے۔ ناول لکھے' رپورتاژ لکھے' خاکے لکھے اور آج کل وہ سچے سادہ مسلمان کی ''تلاش'' میں ہے۔ ان تمام اصناف ادب میں وہ ان کے فنی تقاضے پورے کر رہا ہے کہ نہیں یہ تو ناقدین بتاتے رہیں گے لیکن سچے ادب کے بنیادی تقاضے احسن طور سے پورے کر رہا ہے۔ اس کی وجہ اس کا فنکارانہ عجز ہے۔ وہ خالق ہوتے ہوئے بھی اپنی مخلوق پر اپنی رضا نہیں ٹھونستا۔ ان کی فطرت کے تقاضے سمجھ کر ان کے کردار کشی کرتا ہے۔ اسی لیے اس کے کردار جیتے جاگتے لوگ ہوتے ہیں۔ نیکی بدی کے تضادات سے بھرپور۔ اس لیے منفرد اور دلچسپ۔

ممتاز مفتی کی زندگی اور فن میں قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ایک اہم موڑ ہے۔ مفتی ہمیشہ سے پوجنے کے لیے مافوق الفطرت شخصیتوں کی تلاش میں رہا۔ عقیدت کے نذرانے کبھی ایک بابے کی چوکھٹ پر ڈھیر کرتا کبھی دوسرے بابے کے آستانے پر۔ کچھ عرصہ کوئی اور نہ ملا تو اپنے بیٹے عکسی کو ہی طاق عقیدت میں سجا لیا۔ پھر اس کی ملاقات قدرت اللہ شہاب سے ہو گئی اور وہ دربدر کی تلاش سے نجات پا گیا اور اسی در کا ہو رہا۔ اس نے اپنی تازہ ترین اہم کتاب ''الکھ نگری'' شہاب کی بزرگی سے پردہ اٹھانے کے لیے وقف کر دی ہے۔ نہ جانے وہ کون سا قرض ادا کر رہا ہے۔

زبان و بیان کے سلسلے میں مفتی نہ گرامر کا غلام ہے نہ لغت کا۔ الفاظ اس کے لیے صرف اظہار کا وسیلہ ہیں۔ ان کا بالذات کوئی

تقدس نہیں۔ وہ مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کے لیے الفاظ اور تراکیب کو توڑنے مروڑنے سے نہیں جھجکتا۔ اس عمل میں روزمرہ یا محاورہ کی صورت بگڑ جائے تو اسے کوئی تشویش نہیں ہوتی۔

لفظ ٹکسالی اردو کا نہ ہو تو وہ اسے کھوٹا سکہ نہیں سمجھتا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی ٹکسال لگا رکھی ہے جو اب قبول عام کا درجہ حاصل کر کے سکہ رائج الوقت بن چکی ہے۔ اسی لیے اس کے بیان میں ندرت ہے' انفرادیت ہے' زندگی ہے۔

زبان کے سلسلے میں مفتی کو الفاظ کی صوتی اہمیت کا شدید احساس ہے جس طرح حفیظ جالندھری شعر میں صوتی تاثر کا سب سے بڑا شاعر ہے' اسی طرح ممتاز مفتی نثر میں صوتی تاثر کا ادیب ہے۔

ممتاز مفتی کی ایک نادر خصوصیت یہ ہے کہ جس کسی میں بھی وہ کچھ تخلیقی اہلیت دیکھتا ہے' اسے لکھنے پر اکساتا ہے۔ ہمت افزائی کرتا ہے' رہنمائی کرتا ہے۔ اس نے پچاس کی دہائی میں ''لکھ یار'' کے نام سے ایک انجمن بنائی جس کا مقصد خوابیدہ ادیبوں اور نئے لکھنے والوں کو لکھنے پر مائل کرنا تھا۔ دنیائے ادب میں آج کئی معتبر نام ہیں جنھوں نے مفتی کی تحریک پر لکھنا شروع کیا۔ اس سے ادب سے مفتی کے بے لوث لگن کا اظہار ہوتا ہے۔

ہم نے ایک ٹولی بنا رکھی ہے جس کا نام ہے ''چھڈ یار'' یہ ٹولی ہر سال پاکستان کے خوبصورت علاقوں کی سیر کو جاتی ہے اور ہفتے دس دن تک ذاتی الجھنوں اور معاشرتی تفکرات سے آزادانہ زندگی گزارتی ہے۔ اپنی سالانہ پاکستان گردی میں ایک دفعہ ہم لیپا ویلی گئے جہاں ہم فوج کے مہمان تھے۔ وہاں مفتی کی تحریک پر ادبی رجحان رکھنے والے چند نوجوان لیفٹیننٹوں' کپتانوں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ جب کمانڈنگ آفیسر کو پتہ چلا تو اس نے ایک تقریب میں کہا کہ ابھی تو میں ممتاز مفتی کے ادب سے خاموش ہوں' ان کے جانے کے بعد آپ لوگوں سے نبٹوں گا۔

ممتاز مفتی کی تمام تحریروں کی بنیادی خصوصیت بیان کی دلچسپی ہے۔ ذکر عشق و عاشقی کا ہو' نفسیاتی بھول بھلیاں ہوں یا صوفیانہ مشاہدات و واردات' ان کا بیان دلچسپ ہوتا ہے۔ پڑھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ مفتی کے جملوں میں ڈرامائی کیفیت' انوکھا پن' صوتی تاثر اور بصری Image ہوتے ہیں۔ قاری اس کے نظریے سے اتفاق کرے نہ کرے' اس کے بیان کی دلچسپی کے طلسم میں کھو جاتا ہے۔ اس کے پیرایہ بیان سے لطف اندوز ہوتا ہے اور پڑھتے رہنے پر مجبور۔ مفتی کی ہر دور کی تحریروں میں یہ قدر مشترک ہے۔ وہ کل بھی قابل مطالعہ تھا آج بھی Readable ہے۔

◆◆◆

کومل

(شبنم شکیل)

اظہار کے حوالے سے شخصیتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ کچھ بند بند' کچھ کھلی کھلی اور کچھ کھلی بند۔

بند شخصیت آڑھتی کی دکان کی طرح ہوتی ہے۔ سامنے کچھ دھرا نہیں ہوتا' دکان خالی پڑتی ہوتی ہے۔ مال بوریوں میں بند اندر گودام میں دھرا ہوتا ہے۔ بوریوں کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ ان میں چنے بھرے ہوئے ہیں یا بادام۔

کھلی شخصیت حلوائی کی دکان کی طرح ہوتی ہے۔ سارا مال باہر تھالوں میں لگا ہوتا ہے۔

کھلی بند حکیم کی دکان جیسی ہوتی ہے۔ شربت باہر دھرے ہوتے ہیں' عرق اندر۔

شبنم کی شخصیت کچھ زیادہ ہی کھلی کھلی ہے۔ دیوان خاص کی طرح محرابیں ہی محرابیں ہیں۔ دروازے ہی دروازے ہیں' کوٹھری کا وجود نہیں ہے۔

شبنم کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بارہ دری ہے۔

شبنم کی شخصیت میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں کوئی کوٹھڑی نہیں ہے۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے کہ جس کی شخصیت میں کوٹھڑی نہ ہو اسے بڑے بڑے صائب جھیلنے پڑتے ہیں۔

شاید ان مصائب کی وجہ سے شبنم کی شخصیت میں ایک واضح اور نمایاں ٹوٹ ہے جو سرسری نگاہ سے نظر نہیں آتی۔ چونکہ کوملتا نے اسے ڈھانپ رکھا ہے۔

درحقیقت شبنم کی شخصیت کی بنیادی خصوصیت کوملتا ہے۔ وہ کومل ہے۔ نازک ہے۔ فریجائل ہے۔ لگتا ہے کہ تیز ہوا چلی تو پتی پتی ہو کر بکھر جائے گی۔ پنجابی میں اسے ''کچ دے گلاس ورگی'' کہتے ہیں۔

موسیقی کی اصطلاح میں کومل کا مطلب ہے آدھی سر یعنی ٹوٹی ہوئی سر۔

موسیقی میں دو قسم کی سریں ہوتی ہیں اٹوٹ اور ٹوٹی ہوئی۔ تیور اور کومل۔ پتہ نہیں آدھی سر کیوں میٹھی ہوتی ہے' کیوں دل کی

دھڑکنوں کے ساتھ گھل مل جاتی ہے۔ تیور شور مچاتی ہے' چیختی ہے' چلاتی ہے۔ آج کی میوزک کی طرح جو دل کو نہیں ٹانگوں کو جھلاتی ہے۔

راج گنی کہتے ہیں راگ ودھایا میں سارا درد ٹوٹی ہوئی آدھی سروں کی وجہ سے ہے۔

شبنم ٹوٹی ہوئی آدھی سر ہے۔ جبھی درد تو جان بنا بیٹھا ہے۔

صاحبو! میں بڑا قلمکار نہیں ہوں کہ ایک آنسو میں غم درد کہہ سکوں۔ اختصار کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ پھر بھی مختصر یہ ہے کہ شبنم میں وہ تمام خصوصیات ازل سے موجود تھیں جو بظاہر لائق تحسین سمجھی جاتی ہیں لیکن درحقیقت زندگی کو المیہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں۔

ا۔ کہ وہ عورت تھی۔

۲۔ کہ وہ حسین تھی۔

۳۔ کہ وہ کومل تھی۔

۴۔ کہ وہ شاعر تھی۔

۵۔ کہ اس کی شخصیت ساری کی ساری باہر دھری تھی۔

شبنم کو حس اور حسن والدہ نے عطا کئے۔ شاعری باپ سے ورثہ میں ملی۔ علم وادب ماحول نے دیا۔

باپ شہرت زدہ تھا۔ شاعر تھا' عالم تھا' نقاد تھا' محقق تھا' استاد تھا' خوش شکل تھا' خوش گفتار تھا۔ شاگردوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ مداحوں میں طالبات پیش پیش تھیں۔ چاروں طرف سے تحسین بھری نگاہیں گھیرے رکھتیں۔ سیانے کہتے ہیں اگر حالات اس حد تک سازگار ہو جائیں تو ماسٹرز مانسٹرز بن جاتے ہیں۔ علم وادب کی وینٹی بت بنا دیتی ہے۔

علم وادب کا دولہا بن جاؤ تو گھر کوسوں دور ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی اگر درس وتدریس کی محفل آرائی بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ شاہ جہاں نے جب بیٹے سے استدعا کی تھی کہ مجھے بچوں کو پڑھانے کی اجازت بخشی جائے تو اورنگزیب عالمگیر نے سچ کہا تھا۔ ''ابا جان! ابھی طبیعت سے حکومت کی بو نہیں گئی۔''

جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں' ان دنوں پنجاب کے علمی ادبی حلقوں پر چند نیازمندان پنجاب حکمران تھے۔ ان میں تمام تر صلاحیتیں اور قابلیتیں موجود تھیں۔ صرف نیازمندی سے محروم تھے۔ التزاماً بے نیاز تھے۔ ان کا سکہ چلتا تھا۔ گردنیں اکڑی ہوتیں۔

کلاہ کج' انداز کلف زدہ' ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات فیشن بن جاتی تھی۔ ان کی ذاتی رائے حتمی حقیقت سمجھی جاتی تھی۔

ان میں تخلیقی صلاحیتیں تو تھیں لیکن تخلیق کے عمل کی طرف خصوصی توجہ نہ تھی۔ جو شہرت کے جھولے میں براجمان ہو وہ تخلیق کی مشقت میں کیوں پڑے۔ ان کے علمی ادبی اور درسی تفاخر کا یہ عالم تھا کہ خدا بنے بیٹھے تھے۔

صاحبو یہ سنی سنائی نہیں آنکھوں دیکھی بات ہے۔ شبنم کے والد اس خدائی ٹولے کے ایک معتمد رکن تھے۔

شبنم کی ماں گجرات کی گجری تھی۔ تعلیم یافتہ تھی' کلچرڈ تھی' سوہنی تھی' کچے گھڑے کی روایت سے واقف تھی۔ جانتی تھی کہ حسین ہے۔ اسے حسن کا مان تھا۔ اس حقیقت سے واقف نہ تھی کہ بیوی کے حسن کا مانوسیت کی دیمک چاٹ لیتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ وہ سمجھتی تھی کہ خاوند بیوی کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔

صاحبو! عورت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ خاوند بیوی کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔ عورت نے آج تک اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ خاوند بیوی کا تعلق' ڈپلومیٹک تعلق ہے۔ خاوند جیت لینا بہت آسان ہے' اسے کیپ کرنا' سدھائے رکھنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن۔

پتہ نہیں شبنم کی والدہ نے میاں کے گرد نسائی فینز کا جمگھٹا کیسے برداشت کر لیا۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ میاں نے چوری چوری ایک مداح سے نکاح پڑھوالیا ہے تو وہ زخمی چیتے کی طرح تن کر کھڑی ہو گئی۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مرد عورت کا تعلق چاہے لاکھ پردوں میں ہو پھر بھی چھپائے نہیں چھپتا۔ اور کوئی کھولے نہ کھولے خود میاں کی آنکھ کھول دیتی ہے۔

شبنم کی والدہ کا مان ٹوٹ گیا۔ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

وہ اسے برداشت نہ کر سکی۔ احتجاجاً بچوں کو لے کر گجرات چلی گئی۔

میاں تو علمی ادبی دنیا کے دولہا تھے' وہ اپنی ''میں'' میں رہے۔ بیوی وقار کی ماری ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصالحت کی کوئی کوشش نہ ہوئی۔ تین سال بچوں کو ایسی معاشی مشکلات میں گزر بسر کرنا پڑا جس کے وہ عادی نہ تھے۔

یہ علیحدگی بچوں کے لیے شاک کی حیثیت رکھتی تھی۔

ادھر تین سال میں سوتیلی کو پتہ چل گیا کہ وہ تو شاعر اور عالم کی مداح تھی لیکن شادی ادیب سے نہیں بندے سے ہوتی ہے۔ ادیب اور ہوتا ہے' بندہ اور۔ اس انکشاف پر اس نے میاں سے علیحدگی اختیار کر لی اور شبنم کی والدہ اور بچے اپنے گھر واپس آ گئے۔

شبنم کے والد پھر سے گھر تو آ گئے لیکن ان کی توجہ باہر ہی بھٹکتی رہی۔ سیانے کہتے ہیں گھر کی آبادی کا انحصار گھر والے کی توجہ پر مبنی ہوتا ہے۔ شبنم کے والد کی توجہ اس قدر بکھر چکی تھی کہ گھر واپس نہ آ سکے۔ اس بے توجہی کو محسوس کر کے کئی ایک بچے الگ ہو گئے۔ لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ لڑکا گھر چھوڑ گیا۔ باپ نے تیسری شادی رچائی تو ماں پھر سے گجرات چلی گئی۔ لیکن بیٹیوں کو ساتھ نہ لے گئی۔ اس وقت شبنم کی عمر بیس سال تھی۔

چھوٹی کا بیاہ ہو گیا تو شبنم سوتیلی ماں کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ سوتیلی کی ساری گھن گرج شبنم پر برسی اور وہ بری طرح سے دکھ سے بھیگ گئی' زخمی ہو گئی۔

صاحبو! قدرت بڑی شاعرہ بنانے کے لیے کیا کیا جتن کرتی ہے۔ درد کی بھیگ نے شاعرہ کو جگا دیا۔ ایک کیل تو ٹھک گیا۔ دیر کی بات ہے میں نے ایک فلم دیکھا تھا۔ اس فلم میں جب بھی ہیروئین کسی تلخ تجربے سے گزرتی جو اس کی روح کو جھلا دیتا تو فلم ڈائریکٹر موچی کی دکان دکھاتا۔ موچی جتے کے سول میں ایک کیل ٹھونک دیتا۔

درد کا ایک کیل تو شبنم کی روح میں ٹھک گیا۔

دوسرا کیل ٹیڑھا تھا۔ تکلیف دہ تھا۔ لیکن لازم تھا۔ اندر کی شاعرہ کو پھل پتیاں لگانے کے بغیر چارہ نہ تھا۔

اندر کا خوابیدہ تخلیق کار ایک حبشی محنت کش کے مترادف ہوتا ہے جو شدت کے تازیانوں سے لہولہان ہوئے بغیر نہیں جاگتا۔

''تو'' کی حیرت جگانے کے لیے ''میں'' کو تیاگ دینا لازم ہوتا ہے۔ مشکل کام تھا۔ شبنم کی ''میں'' بڑی طرح دار تھی' حس تھی' حسن تھا' کوملتا تھی۔ ایسی رنگیلی میں سے کون باہر نکلتا ہے۔ لیکن قدرت بڑی بے رحم ہوتی ہے۔

شبنم پر ایسے تازیانے چلائے کہ وہ لہولہان ہو گئی۔ خود کی سدھ بدھ نہ رہی۔ حوالگی اور سپردگی کا ایسا طوفان چلا کہ ''میں'' کی کینچلی اتر گئی۔ شبنم کی سدھ ایسے بسرائی کہ اس نے از خود اپنی ''میں'' کی ساری بتیاں بجھا دیں۔

ایک جذباتی گھٹن نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس گھٹن میں سے نکلنے کا ایک ہی رستہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔اظہار!

اظہار نے شہرت کو ہوا دی۔ ابھی کھل کر چمکی نہ تھی کہ گھر والوں نے اس کی شادی کر دی۔ میاں روشن خیال تھے' ان میں انڈر اسٹینڈنگ تھی' سبھی کچھ تھا لیکن شہرت سے الرجک تھے' مجبور تھے۔ انہوں نے اظہار پر پابندی لگا دی۔ بیچاری دم بخت ہو کر رہ گئی۔ یہ بہت بڑی اذیت تھی۔ شبنم نے احتجاج کیا۔ یہ انوکھا احتجاج تھا۔ اس نے خودکشی کر لی۔ گھر والوں نے اسے باورچی خانے میں دفنا دیا۔ دس سال اس کی لاش آلو گوشت اور ماش کی دال میں کفنائی پڑی رہی۔ ۱۹۸۰ء میں اظہار پر پابندی اٹھا لی گئی۔ لیکن وہ کہتی ہے'

اب کیا ہے۔ جب پھول کھلے ہوئے تھے' بہار آئی ہوئی تھی' تب باڑ لگا دی۔ جب نغمے بے تاب تھے' تب بانسری کے چھید بند کر دیئے۔ اڑان کے پر کاٹ دیئے۔ اب کیا ہے؟ اب تو کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ خود کو لہولہان کر چکی۔ آپ کو کر دوں گی۔

شبنم کی شخصیت بہت ہٹ کر ہے۔ تخلیق کار ہونے کے باوجود دکھی کی نسبت دکھی زیادہ ہے۔ اور دکھی بھی اک ذرا چھیڑیئے' پھر دیکھئے۔

شبنم عام عورت نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ اس میں تاریں لگی ہوئی ہیں۔ وہ آپ ہی آپ بیٹھی بھن بھن کرتی رہتی ہے۔ اسے عام لوگ پسند نہیں آتے۔ سیدھے چلنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ٹیڑھی چال والے فنکار اور دانشور اچھے لگتے ہیں۔

شبنم ملنسار خاتون ہے۔ تخلیق کاروں سے رابطہ رکھتی ہے۔ تنہائی پسند نہیں۔ ہاں تخلیق کے وقت تنہائی چاہتی ہے۔

شبنم کو خوشی راس نہیں آتی۔ ہر خوشی کسی بیتے ہوئے دکھ کی یاد دلاتی ہے۔ دل میں دکھ کا کانٹا لگا ہوا ہے۔

جانے یا ان جانے میں شبنم کو ساری دنیا سے شکایت ہے کہ اس کے ساتھ ویسا سلوک نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی۔ بے شک شبنم کی یہ شکایت سچی ہے لیکن یہ ان کہی شکایت تخلیق کے حوالے سے اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔

پہلے دنیا نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈالیں۔ اب احتجاجاً وہ خود اپنے پاؤں میں زنجیر ڈالے بیٹھی ہے۔

لیکن جب تک وہ لاگ لگاؤ کی دلدل کو نہیں پاٹے گی۔

جب تک وہ پاؤں کی اس زنجیر سے جو اس نے خود ڈال رکھی ہے آزاد نہیں ہوگی۔ اس کا فن ان بلندیوں کو نہیں چھو پائے گا جو اس کا مقدر نظر آتی ہیں۔

◆◆◆

شہزادی

(پروین شاکر)

ناقد کہتے ہیں باہر کی بات کرو بھیتر کی مت کرو۔صرف خاکہ لکھو۔ہم نے خاکہ نویسی کے اصول جو متعین کر دیئے ہیں۔صرف آؤٹ لائن۔اب اگر میں پروین شاکر کی آؤٹ لائن کی بات کروں تو وہاں تو آؤٹ لائن ہی آؤٹ لائن ہے۔ایسی آؤٹ لائن کہ جس کے چکر میں پڑ جاؤ تو باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔ملے بھی تو باہر نکلنے کو جی نہ چاہے۔

اس آؤٹ لائن کے چکر میں صرف میں آپ ہم ہی نہیں پھنسے ہوئے' خود پروین شاکر بھی پھنسی ہوئی ہے۔باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔اس سے پناہ بھی چاہتی ہے۔اس کا لشکارہ مارے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔

اللہ نہ کرے کسی خاتون کی آؤٹ لائن جاذب نظر ہو۔ہو تو وہ نظروں پر چڑھ جاتی ہے' اس کی زندگی اپنی نہیں رہتی۔لاکھ پھونک پھونک کر قدم رکھے۔خود کو احتیاط کی زنجیروں میں جکڑ لے' امان نہیں ملتی۔

اور پروین کی بدقسمتی تو دو آتشہ ہے۔آؤٹ لائن کے ساتھ ان لائن بھی ہے۔معمولی نہیں بڑی گھمبیر ان لائن ہے۔

میرا مصور دوست آذر ذوبی کہتا ہے کہ مفتی! لفظ کوئی چیز نہیں' زندگی تو لکیروں سے عبارت ہے۔کچھ باہر کی کچھ اندر کی کچھ اوپر کی۔ یعنی کچھ خدوخال کی' کچھ ذہنی رجحانات کی' کچھ تقدیر کی۔

عام طور پر افراد کی زندگی میں ان تینوں میں سے کوئی ایک لکیر حاوی ہوتی ہے۔پروین میں تینوں حاوی ہیں۔

باہر سے دیکھو تو وہ نازک اندام دہان پان لڑکی نظر آتی ہے۔قریب جاؤ تو منظر یکسر بدل جاتا ہے۔آپ کے روبرو ایک بالغ العقل ہوش مند زیرک منفرد خیالات اور مضبوط کردار کی خاتون بیٹھی ہوگی۔

وہ سہارے سے بے نیاز ہے۔ہر بات میں منفرد رائے رکھتی ہے۔مگر سہارا مل جائے تو کفران نعمت نہیں کرتی۔

تکلیف دہ دکھ بھرے ماضی کے باوجود اس کے اندر امید کا دیا روشن ہے۔زندگی کرنے کا عزم موجود ہے۔

پروین کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بیٹے مراد کے لیے جیتی ہے۔

سچ کہتی ہے لیکن کبھی کبھی اس کے انداز کو دیکھ کر شک پڑتا ہے کہ اس میں خود اکیلے جینے کی شکتی بھی موجود ہے۔

گھریلو خوشی کے متعلق قدرت کا اصول سمجھ میں نہیں آتا۔ دانشور سوچ سوچ کر ہار گئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اٹ از ناٹ ان دی فٹنس آف تھنگز۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ زندگی میں ''کوجھیاں'' گھر میں پیڑھے پر بیٹھی چوڑے چھنکاتی ہیں اور سوہنیاں ہو کے بھرتی ہیں۔

پنجابی میں ایک بول ہے۔

گھر کوجھیاں دے پکن پروٹھے

تو سوہنیاں دی اگ نہ بلے

حکماء کہتے ہیں' ٹھیک تو ہے سارا کھیل تو آگ کا ہے۔ حسن تو مفت میں بدنام ہے۔ بے شک حسن میں مرد کو کھینچ لانے کی شکتی موجود ہے لیکن اپنا بنائے رکھنے کی قوت موجود نہیں۔

نطشے کہتا ہے۔

Verily Man loveth danger and play to so loveth He woman:
The most dangerous of all the playthings.

پروین کی شخصیت کے تین پرت ہیں۔

پہلا پرت دیکھو تو لطافت ہے' لے ہے' معصومیت ہے اور حیا کے جال ہی جال۔ دوسرا پرت دیکھو تو منظر ہی بدل جاتا ہے' ''لولی'' وینس ڈی مائلو Spinex بن کر بیٹھ جاتی ہے۔ ذہنی پختگی' مردانہ جرات اور Cruel Realism

جبھی تو سیانے سمجھدار پہلے پرت پر ہی گزارہ کر لیتے ہیں۔ ذاتی تحفظ یا ڈر کے مارے فاصلے قائم رکھتے ہیں۔

تیسرا پرت پیش منظر نہیں' پس منظر ہے۔ دکھ کی ایک بے نام بھیگ جو ساری شخصیت میں لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

پروین شاکر کی پرنم شخصیت کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے دکھ کے پانیوں میں گھرا ہوا ایک سرسبز جزیرہ ہو۔ لیکن اس کی آنکھ میں ایک ایسی نگاہ بھی ہے جو چلتی آندھی کو باندھ سکتی ہے' دریا کا رخ موڑ سکتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اس کی پرنم شخصیت جاذب کیفیت کے علاوہ ایک ہتھیار بھی ہو۔

پھول پر شبنم کے قطرے دیکھ کر کبھی کبھی شک پڑتا ہے کہ دکھ ایک سنگھار بھی ہے ایک انوکھا گرزوراش کا میک۔

پروین کی کہانی بہت ہی سادہ ہے۔

وہ بہاران ہے۔ بہارنیں جسمی طور پر دھان پان ہوتی ہیں لیکن اتنی تیکھی کہ سوئی کی طرح چبھ جاتی ہے۔ کٹر شیعہ خاندان سے تعلق

رکھتی ہے۔

شیعہ خاندان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں آنکھ کھلتے ہی روایت ہے' کلام ہوتا ہے' ردھم ہوتا ہے' لے ہوتی ہے' جذبہ ہوتا ہے' دکھ ہوتا ہے' میر انیس ہوتا ہے۔

پروین اس ماحول میں پل کر جوان ہوئی۔

پھر قدرت نے اس میں تخلیقی کلی ٹانک دی۔ تخلیقی صلاحیت ہوتی تو خوب ہے لیکن المیہ اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ نارمل زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہتا۔

دانشور اس کے سامنے دہری حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ وہ کیفیت جسے Happiness کہا جاتا ہے صرف میڈیا کر کو نصیب ہے۔

لگتا ہے کہ قدرت نے شعراء کو سکھی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا وہ جو زندگی کی انڈر بیٹ کو سننے کی حس سے نوازے جاتے ہیں انہیں ذاتی زندگی بسر کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

بانسری میں چھید اس لیے ڈالے جاتے ہیں کہ سر پیدا ہو۔

پروین شاکر کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ نوازی گئی۔ جو نوازے جاتے ہیں ان اکلاپا مسلط کر دیا جاتا ہے۔ ذاتی خوشی چھین لی جاتی ہے۔ دکھ درد کی ایسی سمرتیاں لگا دی جاتی ہیں کہ وہ ہر لحظہ جھن جھن کرتی ہیں۔

بیچاری قدرت!

پروین شاکر کو سر کرنے میں اسے کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ خانہ آبادی کی عمومیت سے بچانے کے لئے' میاں کے ساتھ ان بن کا کانٹا لگا دیا۔ پروین کی طبیعت میں زود حسی کی بیخ لگا دی ایسی کہ نارمل ازدواجی تعلقات کی متحمل نہ رہے۔ یہ سب اس لیے کہ علیحدگی کے سوا چارہ نہ رہے۔

پھر محبوب کو پروین کے انگ انگ میں رچا کر دونوں کے درمیان سماج کی دیوار کھڑی کر دی۔

اور اب۔۔۔۔۔۔اب جبکہ وہ سماجی آزادی' ذہنی پختگی' کرداری استحکام کی سمرتیوں سمرتیوں سے آراستہ ہے اور اس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ پھر سے خانہ آبادی پر مائل ہو جائے قدرت نے اس کے دل میں غیر عقلی اندیشے پیدا کر دیئے ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔

قدرت نے اس کے ذہن کو اس حد تک مسخر کر رکھا ہے کہ وہ اپنی تازہ تصنیف کا نام انکار رکھنے پر مجبور ہے۔

صاحبو شعراء نے ہمیں کنفیوژ کر رکھا ہے۔

آج تک ہم پر یہ بھید نہیں کھلا کہ عاشق کون ہے' محبوب کون ہے۔

شاعر کہتے ہیں' عاشق ہم مرد لوگ ہیں۔ عشق کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ نازک اندام خواتین عشق کے کٹھن مطالبات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔

خواتین کہتی ہیں' مردوں کی بات نہ سنو۔ انہیں بڑ مارنے کی پرانی عادت ہے۔ انہوں نے زبردستی' غنڈہ بازی کے زور پر عشق کے رول پر قبضہ کر رکھا ہے۔ عشق ایک کیفیت ہے جسے کرنے سے نہیں بلکہ سہنے سے تعلق ہے۔ مجنوں بن کر دشت پیمائی کرنا یا رانجھا بن کر مجھیاں چرانا عشق نہیں ہوتا۔ عشق کرنا تو صرف عورت جانتی ہے۔

نفسیات کے ماہر کہتے ہیں کہ مرد تو ہارمونیم کی مصداق ہوتا ہے انگلی رکھ دو تو سر بجتی ہے' اٹھا لو تو ختم ہو جاتی ہے اور عشق تو ایک تسلسل ہے۔ مسلسل جذبہ' آتا جاتا نہیں' قائم۔

اس کے برعکس عورت تو تاریں ہی تاریں ہیں۔ ایک بار چھڑ جائے تو پھر چھڑی رہتی ہے۔

مجھے شاعرات سے شکایت ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں صرف انسانی جذبات کا ذکر کیا ہے۔ نسائی جذبات کا نہیں۔

پروین نے اپنے کلام میں نسائی جذبات پر بات کی ہے۔ کھل کر نہیں' یہاں وہاں کہیں کہیں اشارات میں۔

کہتی ہے' عورت بیک وقت عاشق بھی ہے اور محبوب بھی مرد تو صرف مضراب ہے جو چھیڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔

اشفاق احمد ورک نے جو پائے کا مزاح نگار ہے خوشبو والی شاعرہ کے عنوان سے پروین شاکر کا خوبصورت لکھا ہے۔

نسائی جذبات اور شاعرات کے متعلق ورک لکھتا ہے۔

''اس دنیا میں غزل کی وجہ آغاز عورت اور عورت کی وجہ آغاز مرد ہے اور اب یہ تینوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مردوں کے ساتھ خواتین شاعرات کی بھی کمی نہیں۔ مگر ان میں اکثر کے ہاں شاعرہ بولتی ہے تو عورت غائب ہو جاتی ہے اور عورت کی آواز سنائی دیتی ہے تو شاعرہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔''

پروین شاکر پہلی خاتون شاعرہ ہے جس کے ہاں عورت اور شاعرہ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

پروین شاکر کے کلام کے متعلق ورک لکھتا ہے۔

''پروین شاکر کو زبان پر پوری گرفت ہے۔ اردو زبان پر اور اپنی زبان پر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور ارشادات اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔ جو چاہتی ہے لکھ دیتی ہے۔ لوگ بھی وہی چاہتے ہیں جو لکھ دیتی ہے۔''

اتنی سی عمر میں اس نے اتنے کام کر لیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ آگے چل کر کیا کرے گی' کیا نہیں کرے گی جبکہ میرے فلسفی دوست مسٹر الو کا کہنا ہے کہ ایسے کام صرف اس عمر میں ہو سکتے ہیں۔

◆◆◆

گڈی

(نیلوفر اقبال)

نیلوفر اقبال ایک جاذب نظر ہرے بھرے شگفتہ وشاداب جزیرے کی مصداق ہے جسے کرنل محمد خان' مشکور حسین یاد اور احمد ندیم قاسمی نے دریافت کیا۔

نیلوفر اپنی شگفتگی اور شادابی میں اس قدر مگن اور مطمئن تھی کہ اسے دریافت ہونے سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔

نیلوفر کی مشکل یہ ہے کہ وہ صرف بنی بنی جاذب نظر گڈی ہی نہیں' ساتھ توجہ طلب بھی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ توجہ طلبی عام توجہ طلبی نہیں ہے اس کے ساتھ کئی ایک اگر مگر بندھے ہوئے ہیں۔ مثلاً توجہ میں شدت نہ ہو' شور شرابا نہ ہو' خواہش نہ ہو' اظہار میں تلخی نہ ہو' ہنگامہ نہ ہو' مطالبہ نہ ہو۔ تحسین بھری نگاہیں مدھم مدھم رہیں۔

یعنی ہلکے ہلکے بادل چھائے رہیں۔ گرج نہ ہو' چمک نہ ہو' موسلا دھار نہ ہو' ننھی ننھی بوندیاں' ہلکی ہلکی پھوار برکھارت کا سا ماحول پیدا ہو جائے۔ صرف ماحول اور وہ قائم رہے۔

تعجب کی بات ہے کہ نیلوفر ایسا ماحول قائم رکھنے میں زندگی بھر کیسے کامیاب رہی۔

بظاہر یہ مطالبہ بڑا ٹھنڈا میٹھا لگتا ہے کہ تحسین کا بھور سے تو قائم رہے۔ خواہش کا سورج نہ چڑھے لیکن اس کے لیے آہنی عزم کی ضرورت ہے اور نیلوفر کو آہنی عزم حاصل ہے۔

اللہ نہ کرے کوئی کسی ماحولی محبوب کے چکر میں پھنسے۔ بدقسمتی سے میں اس صورت حال سے واقف ہوں۔

میری پہلی محبت ایک ماحولی خاتون سے ہوئی تھی۔ اس کا بھی یہی مطالبہ تھا کہ نمی نمی تحسین کا بھور سے قائم رہے' خواہش کا سورج نہ چڑھے۔

سولہ سال میں تحسین بھرا ماحول قائم کرنے کی پھانسی پر لٹکا رہا۔ کبھی کبھی میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوتی تھی کہ بے رحمی کے محکمے میں جا کر رپٹ لکھوا دوں۔

نیلوفر کی میدان ادب میں آمد کی تمام تر توجہ کرنل محمد خان کی پھلجڑیاں ہیں۔ کرنل محمد خان دو دھاری ہے۔ فوجی بھی ہے' ادیب

بھی۔مولوی بھی ہے رند بھی۔مزاح بھی ہے طنز بھی۔

سبھی جانتے ہیں کہ لکھنے کے دھندے میں کوئی یافت تو ہوتی نہیں۔سوائے اس کے کہ چند ایک فین مل جاتی ہیں۔خط وکتاب چل پڑتی ہے اور مصنف خطوں میں منہ زبانی پھلجڑیاں چلا چلا کر گزر راہ کر لیتا ہے۔

اتفاقاً کسی کے خطوں میں کرنل کی پھلجڑیاں دیکھ کر نیلوفر نے سوچا' چلو میں بھی طبع آزماؤں۔ادب میں طبع آزمانے کے تمام کوائف موجود تھے۔

ایم اے انگلش تھی۔انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ کر چکی تھی۔مختصر افسانے کے تمام لوازمات سے واقف تھی۔منٹو اور عصمت کی تحریروں سے متاثر تھی۔

یونیورسٹی کے زمانے میں کالج میگ کے لیے اس نے چند ایک چیزیں انگریزی میں لکھی تھیں۔ان میں سے ایک کہانی پھر سے اردو میں لکھی اور بگلا کے عنوان سے ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' میں شائع کروادی۔

کرنل محمد خان نے یہ کہانی پڑھی اور ایک خط میں دل کھول کر داد دی۔اس پھلجڑیوں والی داد سے نیلوفر کا قلم چل نکلا۔

کچھ دیر کے بعد ایک اور افسانہ ''گھوڑا گاڑی'' لکھ کر کسی جریدے کو بھیجا۔یہ افسانہ مشکور حسین یاد کے ہاتھ آ گیا۔مشکور نے بھانپ لیا کہ یہ تو رئیسانہ گھوڑا گاڑی ہے۔اس کی دلکی چال میں لے ہے۔یہ تو چلے گا۔اس نے مسودہ احمد ندیم قاسمی کو بھیج دیا۔

احمد ندیم قاسمی کی دور رس غنڈی آنکھ نے نیلوفر کی ادبی صلاحیت کو بھانپ لیا۔افسانہ اپنے جریدے ''فنون'' میں شائع کر دیا اور کرنل محمد خان کو خط لکھا کہ ''گھوڑا گاڑی'' والی کا اتا پتا لگاؤ۔

نیلوفر کی جگہ کوئی اور ہوتی تو تین ادبی بڑوں کی واہ واہ پر پھولے نہ سماتی۔گھوڑا گاڑی کو چابک مار کر سرپٹ دوڑاتی اور قاری کو مخاطب کر کے کہتی دیکھا یہ میں ہوں۔میری چال دیکھو رفتار دیکھو۔میں میدان ادب کے افق کو چھو لوں گی۔

لیکن نیلوفر دل سے مدھم ہے۔وہ سرپٹ پسند نہیں کرتی۔بھڑک کر جلنا اسے گوارا نہیں۔ڈگڈگی بجا کر میلہ لانے کی خواہش مند نہیں ہے۔اسے شور و غوغا پسند نہیں چاہے تحسین بھرا ہو۔وہ تو خالی ماحولی ہے۔

نیلوفر خاتون نہیں' لڑکی خاتون ہے۔باہر سے دیکھو تو سدا بہار لڑکی اندر وانی پردھانی خاتون ہے۔باہر سے جاپانی گڈی لگتی ہے۔ذہنی طور پر Mature ہے۔عقلیہ ہے' مدلل ہے' منفرد ہے۔چاہتی ہے کچھ کر دکھاؤں۔اس ''کر دکھاؤں'' میں کر کا عنصر غالب ہے' دکھاؤں کا مدھم مدھم۔

نیلوفر میں میل ملاپ کا عنصر کم ہے۔کہیں جائے گی نہیں۔کوئی آ جائے تو اور بات ہے۔وہ کبھی کسی ادبی محفل میں نہیں گئی تھی۔ کسی ادیب سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ان حالات میں اگر سال میں دوبار ایک بڑے ادبی جریدے میں اس کا افسانہ چھپ جاتا تھا تو کیا یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔بے شک وہ ادبی حلقوں میں پہچانی گئی تھی لیکن خالی پہچانے جانے سے کیا ہوتا ہے جب تک جانے نہ جاؤ۔

چار ایک سال تک تو نیلوفر نے اس شغل کو اپنائے رکھا پھر دفعتاً اسے احساس ہوا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔میں تو جہاں تھی وہیں رہی۔ کچھ بن نہ پائی۔نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ چھ سال اس نے کچھ نہ لکھا۔

احمد ندیم قاسمی حیران تھا کہ وہ گھوڑا گاڑی والی لڑکی کیا ہوئی۔احمد ندیم قاسمی ایک سینئر مسند نشیں ادیب ہے۔رکھ رکھاؤ کا قائل ہے۔لکھنے والے تو آتے جاتے رہے ہیں۔پھر اس نے نیلوفر اقبال کی ڈھونڈ کیوں کی۔اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ایک یہ کہ نیلوفر غیر معمولی ادبی صلاحیت کی حامل تھی۔دوسرے ہوسکتا ہے کہ قاسمی نے نیلوفر کا المیہ بھانپ لیا ہو کہ وہ ماحولی خاتون ہے۔یہی تو اس کا اپنا المیہ تھا۔وہ بھی زندگی بھر ماحولی ہی رہا۔یوں اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی اور اس نے کوشش کر کے نیلوفر کو ڈھونڈ لیا۔اور براہ راست خط لکھ کر اسے پھر سے لکھنے پر مائل کر لیا۔

تین ایک سال کی بات ہے میں گھر آیا تو میری بیوی نے کہا'ایک لڑکی آئی تھی۔ایک لفافہ چھوڑ گئی ہے۔

وہ ایک بڑا لفافہ تھا۔جس میں چار کہانیاں تھیں'ساتھ ایک نوٹ تھا۔اگر آپ کے پاس وقت ہو تو یہ کہانیاں پڑھ کر ان کے بارے میں مجھے بتائیں۔نیچے فون نمبر لکھا تھا۔

میرے اندر کے افسانہ نویس نے مونچھ مروڑی اور بے پروائی سے لفافے کو ایک طرف رکھ دیا۔

چار ایک دن کے بعد میں نے لفافے میں سے ایک افسانہ نکالا اسے پڑھا۔وہ ایک ٹھنڈی میٹھی سپاٹ تحریر تھی'نہ کڑاکا نہ دھماکا۔ میں نے سوچا جب کبھی فون کرے گی تو بتا دوں گا۔کئی ایک دن گزر گئے'اس نے فون نہ کیا۔آخر میں نے فون کیا۔میں نے کہا آپ کا ایک افسانہ پڑھا ہے۔

''کیسا ہے؟''اس نے پوچھا۔

''سوسو ہے۔''میں نے کہا۔''مرکزی خیال کمزور ہے'عامیانہ ہے۔ڈکشن ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''اچھا!''وہ بولی''پھر؟''

میں نے کہا۔''نیلوفر!لکھنے سے پہلے یہ سوچو کہ لوگوں کو بتانے کے لیے کیا تمہارے پاس کوئی بات ہے۔ایسی بات جو وہ نہیں

جانتے یا جسے وہ پورے طور پر نہیں جانتے۔"

"اچھا" وہ بولی۔

پتہ نہیں جواب میں میں نے ڈرل ماسٹر کی طرح اسے کیا کیا داؤ بتائے' مونچھ مروڑ مروڑ کر بتائے۔

اسی رات میں نے اس کی دوسری کہانی پڑھی۔ عنوان تھا "پاؤں" کہانی پڑھ کر میرا تو فلوس اڑ گیا۔ اتنے خوبصورت پاؤں۔ اتنا پیار بھرا رکھاؤ۔ اتنا خوبصورت انداز بیان۔ میں نے نیلوفر کو فون کیا۔

میں نے کہا۔ "نیلوفر! تیرے "پاؤں" پڑھ کر میرا تو کباڑہ ہو گیا۔"

کہنے لگی۔ "کیسے؟"

میں نے کہا۔ "اتنے خوبصورت پاؤں' اتنا خوبصورت بیان۔"

پتہ نہیں میں نے کیا کیا کہہ دیا۔

پھر ایک روز وہ میرے گھر آ گئی۔ کہنے "میں نیلوفر ہوں۔"

میرے سامنے ایک جاپانی گڑیا بیٹھی تھی۔

"ارے" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "پاؤں" تو واقعی اسی کے ہیں لیکن لکھنے والی کون ہے۔

جب اس نے بات کی تو میں حیران ہوا۔ اتنی مدلل اتنی حقیقت پسند اتنی منفرد اتنی خوداعتماد۔

میں نے اسے بہت سمجھایا۔ میں نے کہا' بی بی اگر تو ادیبوں میں شامل ہوئی تو ادیبوں جیسا بننا ہوگا۔

بولی "جیسا کیسا؟"

میں نے کہا۔ "مور کی طرح دم جھلانی پڑے گی' مرغے کی طرح بانگیں دینی پڑیں گی' لقہ کبوتر کی طرح چھاتی پھلانی پڑے گی۔"

ہنسی' بولی۔ "مجھ سے نہیں ہوتا۔"

ایک شام میں اسے زبردستی ادبی محفل میں لے گیا۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ میں نے نیلوفر سے پوچھا۔ "یہ محفل کیسی لگی؟"

منہ بنا کر بولی۔ "بس ٹھیک ہے' تنہائی کا احساس دلاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایسا ہے تو کوئی اور شغل سوچ۔ یہ نہیں چلے گا۔"

بولی "سوچ رہی ہوں۔"

نیلوفر کے اندر کسی مشنری کی روح بیٹھی ہے۔ اسے پاکستان سے لگن ہے۔ چاہتی ہے پاکستان کے لیے کچھ کروں۔ لکھنا اسے جذب نہیں کر سکا۔ کہتی ہے لکھنا ایک شغل ہے کام نہیں۔

پاکستان میں تعلیم کی حالت پر کڑھتی ہے' تعلیمی حالت کو سنوارنے کے لیے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔

اسلام آباد کے چراغ تلے بہت سے گاؤں نہ جانے کب سے منتظر ہیں کہ کوئی آئے پوچھے بھائی کس حال میں ہو۔ آج تک کوئی نہیں آیا۔ ایک روز نیلوفر ایک گاؤں میں جا پہنچی۔ دیکھا کہ کسمپرسی کا عالم ہے' کوئی پوچھنے والا نہیں۔ بچے تو ہیں کوئی پڑھانے والا نہیں۔ چاردیواری تو ہے لیکن سکول پر چھت نہیں۔ بیٹھنے کے لیے ٹاٹ نہیں۔ بلیک بورڈ نہیں۔ پانی پینے کے لیے نہ ڈرم ہیں نہ مٹکے۔ وہ کھڑی ہو گئی' بولی ''میں چھت ڈلواؤں گی' ٹاٹ بچھواؤں گی' ڈرم رکھواؤں گی۔ ماسٹر کو تنخواہ دوں گی' تم اپنے بچوں کو پڑھنے پر آمادہ کرو۔''

گاؤں والے اکٹھے ہو گئے۔ گھبرا کر کے کھڑے ہو گئے۔ یہ فرشتنی کہاں سے آ گئی۔ ان کی نگاہیں تحسین سے بھری ہوئی تھیں۔

اب اس کا یہی کام ہے۔ اسلام آباد کے ارد گرد نیم آباد بستیوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ سکول کی عمارتوں کی مرمت کرواتی ہے۔ بیٹھنے کے لیے ڈسک بنواتی ہے' ٹاٹ بچھواتی ہے۔ سکول کے لیے سارا سامان مہیا کرتی ہے۔ ۲۲ سکولوں کا سامان مہیا کر چکی ہے بیس سکول لسٹ پر ہیں۔

میں نے پوچھا' نیلوفر تیرے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا؟

کہنے لگی۔ ''ایک چھوٹی سی جائیداد ہے جو میں نے خدمت خلق کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ پہلے اکیلی خرچ کرتی تھی اب دوسرے بھی مدد پر آمادہ ہو رہے ہیں۔''

تعاون کی بات پر بولی۔ ''سب سے زیادہ تعاون تو اقبال کرتے ہیں' زندگی بھر کیا۔ میری کسی بات کو نہیں موڑا۔ کبھی نہیں ٹوکا۔ الٹا ہر بات میں ساتھ چل پڑے' ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ وہ ساتھ نہ دیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

مجھے علم نہیں کہ اس کے اندر کا مشنری اسے ادبی شغل قائم رکھنے کی اجازت دے گا یا نہیں۔ ہاں یہ بات یقینی ہے کہ اگر اجازت نہ دی تو اردو ادب کئی ایک اچھی نگارشات سے محروم رہ جائے گا۔

◆◆◆

بلبلے

(شہابہ گیلانی)

شہابہ گیلانی آج کے دور کی لڑکی کی نمائندہ ہے۔اس کی شخصیت کی جزو اعظم بلبلے ہے۔

وہ سوڈے کی بوتل کی مصداق ہے جس میں سے بلبلے اٹھتے رہتے ہیں۔

شہابہ کے جذباتی سلف میں لہریں اٹھتی ہیں' چھینٹے اڑتے ہیں' گھمن گھیریاں گھومتی ہیں۔اس کا ذہنی سلف ایک جھیل کی مانند ہے۔ٹھہرا ہوا نیلا شفاف پانی۔

شہابہ ایک ایسی بگھی ہے جس کا ایک پہیہ گول ہے اور دوسرا چوکور لیکن یہ بگھی چلتی ہے' چلے جاتی ہے۔یوں جیسے پانی میں راج ہنس تیرتا ہے۔

صاحبو! دیکھو' ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھو کہ انسانی شخصیت کا یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ شخصیت دو پہیوں پر چلتی ہے۔ایک گول' دوسرا چوکور۔

میرے زمانے میں بڑی بوڑھیاں ایک کہانی سنایا کرتی تھیں کہ پرانے زمانے کی بات ہے۔ایک تھا بادشاہ' ہمارا تمہارا بادشاہ۔ بڑی منتوں کے بعد اس کے گھر ایک بیٹی ہوئی۔ جو ایک آنکھ سے ہنستی تھی' دوسری آنکھ سے روتی تھی۔ بادشاہ نے اس کا نام شہزادی ''روہنس'' رکھ دیا۔آج کے دور کی نوجوان لڑکیاں سب ''روہنس'' شہزادیاں ہیں۔

آج کی لڑکی میں تین اوصاف نمایاں ہیں۔

غصہ' ڈپریشن' ایلی ویشن

وہ غصے سے چیختی چلاتی ہیں۔لیکن اگر ماحول چیخنے چلانے کی اجازت نہ دے یا طبعاً اس کی اہلیت نہ ہو تو ان چیخ غصے سے ان کا بند بند تھر کتا ہے۔ جیسے اس ٹرک کا بند بند تھر کتا ہے جس کا ڈرائیور بریک لگا کر لیکن انجن چلتا چھوڑ کر خود ٹرک سے ہوٹل میں چائے پینے کے لیے جا بیٹھتا ہے۔

ہاں تو شہابہ غصے میں چیختی چلاتی ہے پھر ہنس پڑتی ہے۔اتنا ہنستی ہے کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور پھر ڈپریشن کا دورہ پڑ

جاتا ہے۔آج کی لڑکی کی یہی داستان حیات ہے۔

چھ سات سال گزرے جب شہابہ پہلی بار مجھے ملی تھی۔

اس ملاقات کے کوائف یوں ہیں کہ میرا ایک عزیز اور دوست صباح مفتی میرے پاس آیا' کہنے لگا۔ایک بات پوچھوں؟

میں نے کہا' پوچھو۔لیکن اتنے معذرت خواہ کیوں ہو۔کہنے لگا' میری ایک یونیورسٹی فیلو آپ سے ملنا چاہتی ہے۔بڑی دیر سے تقاضا کر رہی ہے۔میں اسے ٹالتا رہا ہوں۔کیوں؟ میں نے پوچھا۔

کہنے لگا بڑی ان جھک ہے۔خودسر ہے۔لیکن بڑی قابل ہے۔باکردار ہے۔لڑکے اس سے ڈرتے ہیں۔شہابہ مجھ سے ملی تو میں نے دیکھا کہ ایک طرفہ تماشا ہے۔بات ٹھہری ہوئی یوں جیسے کبھی بہکی نہ ہو۔

آنکھ چھلکی ہوئی یوں جیسے کبھی ٹھہری نہ ہو۔

میں تو گھبرا گیا۔یا اللہ یہ کیا چیز ہے۔

شہابہ مجھے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے ملی تھی۔اتنی چھوٹی عمر اور تخلیق کاری مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

جب اس نے چار ایک مطبوعہ کہانیاں میرے سامنے رکھ دیں تو میں ٹپٹا گیا۔

''یہ شغل آپ نے کب اپنایا؟'' میں نے پوچھا۔

''جب سکول میں پڑھتی تھی۔'' وہ بولی۔

''محرک کون تھا؟''

بولی ''کوئی بھی نہیں۔ہڈی میں رچا بسا ہے۔پہلے شعر کہے۔اب کہانیاں لکھتی ہوں۔

میں نے ذہنی طور پر مونچھ مروڑی۔''اچھا تو آپ میری شاگرد بننا چاہتی ہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ بولی۔

میں چونکا۔''اتنے بڑے جانے پہچانے افسانہ نگار کی اتنی ناقدری۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔''میں وہی کچھ لکھنا چاہتی ہوں جو میں لکھتی ہوں۔''

''کسی کی تصحیح پسند نہیں کرتی۔شاگرد بننا نہیں چاہتی۔خود پر کسی کا ٹھپہ لگانا نہیں چاہتی۔تو پھر یہ کہانیاں آپ کس خوشی میں مجھے دکھا رہی ہیں؟''

وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ارے اتنی بڑی بوندیاں۔

ایک شفاف جھیل کے عقب میں اتنا گدلا پانی۔

کیا یہ کہانیاں آپ مجھے اس لیے دکھا رہی ہیں کہ میں واہ واہ کروں؟ میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں بوندیں اور بھی بڑی ہو گئیں۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ بولی" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ شاید یہ کہانیاں میں اس لیے لائی ہوں کہ آپ واہ واہ کریں۔ ہاں میرا جی چاہتا ہے کہ لوگ میری کہانیوں پر واہ واہ کریں۔"

کہانیوں پر کیوں، آپ واہ واہ کیوں نہ کریں؟ میں نے طنز چلائی۔

وہ ہنسی۔" کرتے ہیں کرتے ہیں سب کرتے ہیں۔ لیکن میں انہیں ڈانٹ دیتی ہوں۔ کیونکہ خود پر واہ واہ کرانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"لیکن آپ تو عورت ہیں۔" میں نے وضاحت کرنا چاہی۔

اس نے میری بات کاٹ دی۔ بولی" پتہ نہیں، میں کیا ہوں۔ بس جو کچھ بھی ہوں یہی ہوں۔ ایسے ہی جینا چاہتی ہوں۔"

ان دنوں شہابہ قائداعظم یونیورسٹی سے فارغ ہو چکی تھی۔ انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایم اے کر چکی تھی۔ کئی ایک ادبی ثقافتی تنظیموں کی انتظامیہ کی رکن تھی۔ اپنے دو ایک جلسوں میں وہ مجھے ساتھ لے گئی۔ وہاں منظر ہی اور تھا۔

نہ وہ بھیگی بھیگی آنکھیں تھیں نہ بڑی بڑی بوندیاں۔ وہ یوں استادہ تھی جیسے سرکس کی ہنٹر والی ہو۔ لڑکوں کو ہدایات جاری کر رہی تھی۔ لڑکوں کی نگاہیں خالی تھیں۔

آپس میں یوں گھلے ملے ہوئے تھے جیسے دونوں میں کوئی فرق نہ ہو۔ وہ فنکشن کو یوں کنڈکٹ کر رہی تھی جیسے گوریلی لیڈر ہو۔ بہرحال وہ شہابہ نہیں تھی جو مجھ سے پہلی بار ملی تھی۔ نہ وہ مسکان تھی نہ بھگو دینے والی پھوار۔

صرف ایلیشن ہی ایلیشن تھی، مردانہ ایلیشن۔

پھر ہم دونوں دوست بن گئے۔ ملنے لگے۔ میرے لیے شہابہ ایک چیلنج تھی۔ مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا مرد نے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا یا عورت نے پگڑی باندھی ہوئی تھی۔

اس کے والدین کو پتہ چلا تو وہ مجھ سے آ ملے۔ کہنے لگے، بڑی خوشی کی بات ہے کہ شہابہ آپ سے ملتی ہے۔ وہ دل کی بہت اچھی

لڑکی ہے لیکن اوپر تلخی اور غصے کی کوٹنگ کر رکھی ہے۔ آپ اس پر اثر ڈالیں۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''شہابہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

وہ میرا جواب سن کر بہت مایوس ہوئے۔

''وہ آپ کے بس کی بات بھی نہیں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اس کی حسیات کا سپکٹ اور ہے آپ کا اور۔''

''تو ہم کیا کریں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آپ اسے کھلی چھوڑ دیں۔ جو مرضی ہے کرنے دیں' روک ٹوک نہ کریں۔''

وہ مجھ سے مایوس ہو کر چلے گئے۔

قدرت اللہ شہاب کی وفات کے بعد ایک روز شہابہ نے مجھے کہا۔ ''پتہ ہے میں آپ سے کیوں ملی تھی؟''

''کیوں ملی تھی؟'' میں نے دہرایا۔

بولی ''میں آپ کو شہاب کے حوالے سے ملی تھی۔''

''تم شہاب کو جانتی ہو کیا؟''

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''ان سے ملی تھی کیا؟''

''ہاں'' وہ بولی۔ ''کئی بار''

''کیا اپنی شادی کے سلسلے میں ملی تھی؟''

''نہیں'' وہ بولی ''شادی کے بارے میں میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔''

''کب سوچو گی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ بولی ''جب حشر کا دن آئے گا۔''

''تو پھر شہاب سے کس مقصد کے لیے ملی تھی؟ کوئی تو مقصد ہوگا۔''

''تھا'' وہ مسکرائی۔

''کیا؟''

''مقصد شہاب تھا۔ شہاب مجھے اچھا لگتا ہے۔ بہت اچھا۔ میں اسے جا ملی۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ کہنے لگے' آپ کیسے آئی ہیں؟ میں نے کہا' بس آئی ہوں۔ انہوں نے کہا' کوئی مقصد تو ہوگا۔ میں نے کہا' آپ سے ملنا مطلوب تھا۔''

شہابہ نے قہقہہ لگایا۔ بولی ''میری بات سن کر شہاب صاحب جھینپے' بہت بری طرح سے جھینپے۔ یوں جیسے ٹین ایجر جھینپتے ہیں۔ مجھے بڑا مزہ آیا۔''

''پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک بات کا پتہ ہے آپ کو۔'' اس نے بات کا رخ بدلا۔

''کیا؟''

''شہاب صاحب نے مجھے بڑی توجہ دی۔''

''حیرت کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں'' وہ بولی۔ ''حیرت کی بات نہیں۔ جو توجہ کا طالب نہ ہوا اسے بھرپور توجہ ملتی ہے۔''

''ان کی توجہ سے تمہیں کیا ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت کچھ'' وہ بولی۔ ''بہت کچھ۔ انہوں نے مجھے ٹرینکولائز کر دیا۔''

میری ہنسی نکل گئی۔

وہ سنجیدہ ہوگئی۔ بولی ''رسی کا ایک ایک بل کھلتا ہوا محسوس ہوا مجھے۔''

''رسی کے بل تو جوں کے توں موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں'' اس نے جواب دیا۔ ''رسی کے وہ بل جو اوپر سے نظر نہیں آتے تھے۔''

میں نے چڑ کر کہا۔ ''بی بی میں شہاب کے ساتھ تیس سال رہا ہوں۔ مجھ میں بھی شدت ہے۔ شین والی شدت نہیں' شوئے والی شدت' مجھ میں بھی غصہ ہے۔ ایسا غصہ جو دھول اڑا دیتا ہے۔ سدھ بدھ نہیں رہتی۔ میری شدت اور غصے کو تو شہاب صاحب نے جذب نہ کیا۔''

''پتہ نہیں کیوں؟'' وہ بولی۔ پھر دفعتاً چلائی۔ ''ہاں' ٹھیک تو ہے۔ آپ کے بارے میں شہاب صاحب نے لکھا تھا کہ مفتی کی دوستی پھوڑے کی طرح ہے جس کی ٹیسوں میں لذت ہے۔ یاد ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں یاد ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

بولی ''شہاب صاحب ان ٹیسوں کی لذت سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے آپ کی رسی کے بل نہ کھولے۔''

شہابہ کے ساتھ بحث کرنا بالکل بیکار تھا چونکہ بحث اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ میں اسے کہا کرتا تھا' شہابہ شادی کر لے۔ وہ قہقہہ مار کر ہنستی۔ کہتی ''مفتی جی! آپ کیوں مجھے برباد کرنے پر تلے بیٹھے ہیں؟''

''میں تو تیری آبادی کی بات کر رہا ہوں۔''

''نہیں نہیں' آپ نہیں سمجھتے۔ میرا شادی کرنا بہت Risk ہے۔''

''کیا رسک ہے؟'' میں پوچھتا۔

کہتی' ''اگر میں شادی کرلوں تو اس کے دو نتیجے ہو سکتے ہیں یا تو اس کے پرخچے اڑ جائیں گے جو مجھ سے شادی کرے گا یا میرے پرخچے اڑ جائیں گے۔''

''اس میں تو کوئی رسک نہیں۔'' میں جواب دیتا۔

وہ قہر آلود نگاہ سے مجھے دیکھتی۔ ''آپ کو اس میں رسک نظر نہیں آتا۔''

''نہیں'' میں جواب دیتا۔ ''اگر اس کے پرخچے اڑ گئے تو تم بچ جاؤ گی۔ اور اگر تمہارے پرخچے اڑ گئے تو ساری مشکل حل ہو جائے گی۔ رسی کے سارے بل کھل جائیں گے۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے میری جانب دیکھتی۔ کہتی۔ مفتی جی ''یو آر اے ہارٹ لس مین۔

جب میں شہابہ کی والدہ سے کہتا کہ بی بی اس کی شادی کر دو تو وہ میری طرف حیرت سے دیکھتی۔ کہتی' مفتی جی! وہ کون سا مائی کا لعل ہوگا جو اس کا غصہ برداشت کرلے گا۔

پھر وہ دن آ گیا۔ جب وہ مائی کا لعل اتفاقاً ان کی گلی میں داخل ہو گیا۔ اس وقت شہابہ گھر سے باہر باغیچہ میں کھڑی غصے میں چیخ چلا رہی تھی۔ شہابہ کی چیخ و پکار سن کر وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔ دیوانہ وار اسے دیکھنے لگا۔

شہابہ کو اس کی دیوانگی پسند آ گئی۔

حشر کو وہ دن آ گیا جس کا شہابہ کو خوف تھا۔

ایک دھماکہ ہوا۔ دونوں کے پرخچے اڑ گئے۔ نہ مائی کا لعل رہا نہ شہابہ۔

ایک طوفان چلا۔ بنگلہ دیشی طوفان جو سب کچھ بہا کر لے گیا۔ شہاب کی توتراخ' اس کی ''میں'' میں وہ ہنٹروالی' اس کا سرکس' وہ تخلیق کار' اس کے شعر' اس کی کہانیاں' سب فنا ہو گئے۔

آج چار سال بعد طوفان کا گردوغبار چھٹ رہا ہے۔ شہاب کے بکھرے ہوئے اعضا سمٹ رہے ہیں۔ اس کی شخصیت کے اجزاء پھر سے جڑ رہے ہیں۔ اس کی ''میں'' کو زبان مل رہی ہے اور تخلیق کو اظہار۔ فتنہ پھر بیدار ہو رہا ہے۔

◆◆◆

گوریلی

(نیلم احمد بشیر)

پندرہ سال امریکہ میں قید تنہائی کاٹنے کے بعد نیلم لاہور آگئی ہے اور امریکہ کی قید تنہائی کا انتقام لاہور سے لے رہی ہے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ "گری گدھے سے غصہ کمہار پر"

صاحبو! مہذب ہونے کے باوجود تمدن اور ترقی کے باوجود جس کے ہم داعی ہیں اپنی چٹی قمیص اور سٹف کالر کے باوجود آج بھی ہم گرتے گدھے سے ہیں اور غصہ کمہار پر نکال کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

ماں اپنے میاں کا غصہ بچوں پر نکالتی ہے۔ باپ صاحب کا غصہ بیوی پر نکالتا ہے اور ساس اپنی جوانی کا غصہ بہو پر نکالتی ہے۔

نیلم کے انتقام کے کوائف اگرچہ دیکھنے میں انوکھے لگتے ہیں لیکن وہ انوکھے نہیں ہیں سیدھے اور صاف ہیں معصوم ہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے پٹارے کھولے بیٹھی ہے۔ وہ صلاحیتیں جن کے اظہار کا اسے موقعہ نہ دیا گیا تھا مہلت نہ دی گئی تھی۔ بدقسمتی سے ان صلاحیتوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی جن کی نمائش سے وہ محروم کر دی گئی تھی۔

بار بار انہیں بند گرد آلود پٹاروں سے نکالتی ہے جھاڑتی ہے پونچھتی ہے چمکاتی ہے۔

پندرہ سال نیلم خود کو دکھانے کی فطری اور معصوم لذت سے محروم رہی۔ اب اس پر خوف طاری ہے کہ یہ محرومی المیہ نہ بن جائے۔ اس لیے وہ بنتی ہے سنورتی ہے ہر حربہ آزماتی ہے کہ وہ دکھے۔

وہ بھولی بسری پکے راگ کی بندشوں کو پھر سے تازہ کر رہی ہے۔ ٹھمریوں کے بھولے ہوئے بول یاد کر رہی ہے۔ کتابوں کو شیلفوں میں سجا رہی ہے۔ دھڑا دھڑ افسانے لکھ رہی ہے۔

ابھی قید تنہائی میں نکلے ہوئے اسے تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے لیکن وہ اتنے ڈھیر سارے افسانے لکھ چکی ہے کہ اب ان کا مجموعہ چھپوانے کا اہتمام کر رہی ہے۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے کہ ناموافق حالات کے تحت مرد بجھ جاتا ہے عورت بجھتی نہیں۔ بظاہر راکھ بن جاتی

ہے لیکن موافق ہوا کا جھونکا آئے تو راکھ اڑ جاتی ہے اور نیچے دبا ہوا انگارہ باہر نکل آتا ہے۔ نیلم کی راکھ اڑ رہی ہے۔ دبا ہوا انگارہ باہر نکل رہا ہے۔

لیکن جب تک قید تنہائی کی وضاحت نہیں ہوگی' بات آپ تک نہیں پہنچے گی۔ قید تنہائی ایک رسم زدہ لفظ ہے۔ الفاظ رسم زدہ ہو جاتے ہیں تو مفہوم کی خوشبو اڑ جاتی ہے' صرف ڈھانچا باقی رہ جاتا ہے۔ جبھی ہمارے تنقیدی مضامین میں ڈھانچے ہی ڈھانچے ہوتے ہیں۔ صرف فریم۔ خالی فریم۔

پندرہ سال نیلم شہروں سے دور امریکہ کے دیہات کے ایک فلیٹی پنجرے میں قید رہی۔ یہ پنجرہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے کنارے پر ٹنگا ہوا تھا۔ گاؤں پر ہر وقت ایسا سناٹا طاری رہتا تھا جیسے قبرستان ہو۔ کبھی کبھی بوڑھوں کے کھاؤں کھاؤں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں جو اس سناٹے کو اور بھی بھیانک کر دیتیں۔

امریکہ کے دیہات کے نوجوان تلاش معاش اور شغل میلے کے لیے شہروں میں جا بستے ہیں۔ یوں دیہات اولڈ ہاؤس بن کر رہ جاتے ہیں۔ بوڑھوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ کیسے ہو' کیا کر رہے ہو۔ کوئی امید نہیں ہوتی' کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ نہ رخ' نہ سمت جیسے کھلے پانیوں میں ٹوٹی ہوئی کشتیاں ڈول رہی ہوں۔

وہ یوں وقت گزارتے ہیں جیسے پلیٹ فارم پر بیٹھے انتظار کر رہے ہوں کہ جب گاڑی آئے اور وہ رخصت ہو جائیں۔

امریکی بوڑھے ڈال سے ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح ہوتے ہیں جو ایک ہی جگہ پڑا پڑا گل سڑ جاتا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہو تو انسان گوشت کا لوتھڑا بن کر رہ جاتا ہے۔

دو ایک بار نیلم اپنے میاں کے ساتھ گاؤں میں گئی تھی لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر سہم گئی۔

بوڑھے کھڑکیوں سے حسرت زدہ اور نا امید نگاہوں سے جھانک رہے تھے۔ بستر پر لیٹے کھاؤں کھاؤں کر رہے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھے خلا کو گھور رہے تھے۔ کسی کا سر روئی کے گالے کی طرح ہل رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ کانپ رہے تھے' کسی کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔

ہم امریکی بوڑھوں کو تصور نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں کا بوڑھا بوڑھا نہیں بلکہ بڑا ہوتا ہے۔ گھر کا سردار ہوتا ہے۔ گاؤں کا پنچ ہوتا ہے۔ حکم چلاتا ہے۔ فیصلے دیتا ہے۔

مغرب کے بوڑھوں کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ جوائنٹ فیملی سسٹم بنانے والے کتنے سیانے تھے۔ انہوں نے یہ راز پا لیا تھا کہ جوائنٹ نہ ہوئی تو فیملی کو قیام حاصل نہ ہوگا۔

نیلم کا خاوند کمیونٹی نرسنگ ہوم کا ڈاکٹر تھا جو سارا دن ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ اس کا ہسپتال شاہراہ کے کنارے پر واقع تھا تاکہ گاؤں والوں کو فوری اور فرسٹ ایڈ کی ضرورت پڑے تو وہ اس سرراہ ڈسپنسی میں میڈیکل مدد حاصل کر سکیں۔

پندرہ سال پہلے جب نیلم یونیورسٹی کے فائنل ائیر میں تھی تب اس کے ذہن Looking فارورڈ لڑکی کی طرح بڑے بڑے پروگرام تھے۔ صرف فائنل امتحان کا انتظار تھا۔ اس کے دل میں اتنے سارے شوق یوں بھن بھن کر رہے تھے جیسے بھڑوں کا چھتا ہو۔ موسیقی سیکھنے کا شوق تھا۔ ڈرامہ کھیلنے کی دھن تھی۔ پینٹنگ کرنے کا ذوق تھا۔ ادب پر تو وہ جان چھڑکتی تھی۔ دراصل یہ تمام بیماریاں اسے ورثے میں ملی تھیں۔ چونکہ وہ جانے پہچانے صحافی احمد بشیر کی بیٹی ہے۔

پھر ایک دن جب نیلم جاگتے کے خواب دیکھ رہی تھی اس کے والد نے گھر میں ایک دھماکا کر دیا۔ کہنے لگے۔ ''بیٹی! میں نے ایک صاف ستھرے نیک دل ڈاکٹر کا رشتہ تیرے لیے منظور کر لیا ہے جو امریکہ میں ملازم ہے۔ پرسوں تیری شادی ہو جائے گی اور اس کے تیسرے دن بعد تو امریکہ چلی جائے گی۔''

احمد بشیر ایسے دھماکے کرنے کا عادی تھا۔ اس نے اپنی چاروں بیٹیوں کی دھماکہ شادیاں کی تھیں۔ اس کی اپنی شادی بھی دھماکہ شادی تھی۔

اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی پر اس نے مجھے خط لکھا۔ ''پیارے ممتاز! میں نے ہومی کی شادی کر دی ہے۔ شادی پر کل چار سو پچاس روپے خرچ ہوئے ہیں اور ہم نے جہیز لینے سے انکار کر دیا ہے۔ کیوں کیسا؟''

ایسے کاموں پر احمد بشیر خواہ مخواہ کریڈٹ طلب کرتا ہے۔ درحقیقت سارا کریڈٹ اس کی بیوی مودی کو جاتا ہے۔ اگر میں ایسی حرکت کرتا تو میری بیوی مجھے گھر سے نکال دیتی۔

نیلم کی زندگی میں یوں بیٹھے بٹھائے آناً فاناً نیچے اوپر دو حادثے ۔۔۔۔۔۔۔ ایک شادی دوسرا امریکہ جانا عمل میں آئے تو وہ بوکھلا گئی۔ ہم سمجھے کہ بوکھلاہٹ امریکہ جانے کی خوشی کی غماز ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ جس امریکہ میں وہ جا رہی ہے وہ ایک فلیٹی پنجرہ ہے جو ایک قبرستانی گاؤں کے کنارے لٹکا ہوا ہے۔

جس گھر میں نیلم پیدا ہوئی اور پروان چڑھی وہ ایک چوں چوں کا مربہ گھر تھا۔ گھر میں کتابیں تھیں' ستار تھی' کتھک اور کتھاکلی کے انگ تھے۔ ادیبوں' دانشوروں اور فنکاروں کی بیٹھکیں جمتی تھیں۔ سبھی کچھ تھا مگر کھانے کو روٹی نہ تھی۔

احمد بشیر نے سارے پاپڑ بیل دیکھے۔ فلساز بنا' افسر بنا' صحافی بنا' گدھا گاڑی چلائی' کپڑا بیچا' شہرت پائی' نام بنا لیا لیکن گھر میں

صرف دو دور ہی رہے۔ دال روٹی کا دور اور گوشت روٹی کا دور۔

گھر میں سات جی تھے۔ احمد بشیر' اس کی بیوی مودی' چار بیٹیاں نیلم' پپو' گوپی اور مانو اور ایک بیٹا ہوبی۔ لیکن روٹی کا فکر صرف مودی پر طاری رہتا تھا۔

نیلم' پپو موسیقی سے دل بہلایا کرتیں۔ احمد بشیر بھوک کے مارکسی فلسفے پر غور کرنے لگ جاتا۔ چھوٹے بچے گلی میں کھیل کود کر وقت گزار لیا کرتے۔ صرف مودی ماہی بے آب کی طرح سارے گھر میں گھومتی پھرتی۔ ''اب میں کیا پکاؤں؟''

سارا قصور احمد بشیر کی Genes کا ہے۔ اس کی جینز میں تین بنیادی عناصر نمایاں ہیں۔ قابلیت' ایڈونچر اور دیوانگی۔ لڑکیوں نے یہ تینوں خصوصیات ورثے میں پائی ہیں۔

نیلم میں قابلیت کا عنصر کچھ زیادہ ہی تیز تھا۔ ایڈونچر کے عنصر کو آج کل وہ لاہور میں انتقاماً برت رہی ہے۔ اس ایڈونچر کا کوئی مقصد نہیں' کوئی منزل نہیں۔ صرف آرٹ فار آرٹ سیک۔

نیلم نے مجھے لکھا۔ ''بابا! میں کہانیاں لکھ رہی ہوں۔ کیا کروں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''نیلی! کہانیاں لکھ نہیں' کہہ۔ قاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ۔ ٹھنڈی میٹھی نہ لکھ' پکوڑے تل۔ اتنے کرارے کہ لوگ سی سی کریں۔ ناک منہ سے پانی بہے' رال ٹپکے' کردار نظر آئیں نہ آئیں مصنفہ چھائی رہے۔''

نیلم نے کہا۔ ''بابا! میں نے پکوڑے تلے لیکن ناشر چھاپتے نہیں۔ کہتے ہیں' نمک مرچ کچھ زیادہ تیز ہے۔ اب کیا کروں؟''

میں نے کہا۔ ''پیاری! پکوڑے بین السطور ہوتے ہیں' لفظوں میں نہیں آتے۔ قاری سمجھے کہ رس گلا ہے لیکن کھاتے وقت سی سی کرے۔''

صاحبو! میری مشکل یہ ہے کہ میرے دوستوں کے بچے بھی میرے دوست بن جاتے ہیں۔ پھر کچھ ایسی صورت بن جاتے ہیں کہ ''محتسب سے دوستی ساقی سے یارانہ رہے''

دراصل احمد بشیر کا گھر ایک پاگل خانہ ہے۔ پروین عاطف کہتی ہے کہ یہ پاگل پنا میں ان کے گھر میں لایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا پاگل پنا ان کی صحبت کا نتیجہ ہے۔

گورداسپور میں احمد بشیر کے ماموں اشفاق حسین جو آج کل اسلام آباد میں ہومیو پیتھی پریکٹس کرتے ہیں' کے گھر روز محفل موسیقی لگتی تھی۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ میں وہاں طبلہ سیکھنے کے شوق میں گیا تھا' آج تک گھر واپس نہیں آیا۔ اس گوریلا گروپ نے مجھے

ایسا چھا مارا کہ انہی کا ہو رہا۔

دراصل یہ لوگ ایمن آباد کے شیخ ہیں جنہیں شیخ بن کر زندگی بسر کرنا منظور نہ تھا۔ چونکہ ٹیلنٹڈ فنکار تھے۔ شیخ خاندان میں صرف ایک ٹیلنٹ کی عزت تھی۔ کاروبار۔ وہ آرٹ فار پرافٹ کے قائل تھے' آرٹ فار آرٹ سیک کو حماقت سمجھتے تھے۔ لہٰذا یہ گوریلے بن گئے۔ اشفاق حسین اور احمد بشیر اوور گراؤنڈر ہے۔ پروین عاطف' نیلم اور پوانڈر گراؤنڈ ہو گئیں۔ میرا دونوں سے رابطہ رہا۔

اوور گراؤنڈ والے سمجھتے کہ میں ان کا ساتھی ہوں۔ انڈر گراؤنڈ والے سمجھتے کہ میں ان کا 007 ہوں۔

احمد بشیر کا گھر دھوپ چھاؤں کا امتزاج ہے۔ چھاؤں کو دیکھو تو بہت ٹھنڈی ہے لیکن دھوپ کڑاکے دار ہے۔ احمد بشیر نے بڑی فراخدلی سے اپنے گھر کو جمہوریت دے رکھی ہے لیکن گھر میں صرف احمد بشیر کی چلتی ہے۔ جو در پردہ بہت بڑا آمر اور ظاہر میں جمہوری جمہور ہے۔ مارکسی جمہور۔ پیار اس کا واحد ہتھیار ہے جس کے زور پر وہ گھر اور دوستوں کو اپنی مرضی سے چلاتا ہے۔ عام طور پر گھر والے اپنی کمائی کے زور پر گھر چلاتے ہیں۔ احمد بشیر دانشوری کے زور پر گھر چلاتا ہے۔

Hats off to Moodi

احمد بشیر نے ساری زندگی التزاماً گھر پر غریبی طاری رکھی ہے۔ زیادہ آ جائے تو بانٹ دیتا ہے۔ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کہیں زیادہ آنے کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ نیلم ان حالات کے تحت پلی ہے۔

نیلم زندگی کے انوکھے مشاہدات سے گزر رہی ہے۔ اوکھے لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ اندر باہر کا فرق سمجھا ہے۔ معصوم ہیرا پھیریوں کو جانا ہے۔ زندگی بھر اسے یہ خوف دامن گیر رہا ہے کہ میں کبڑی نہ رہ جاؤں کیونکہ اسے علم تھا کہ بڑے اور گھنے درخت تلے اگنے والے بوٹے لازماً کبڑے رہ جاتے ہیں۔ اس کے دل میں احتجاج کی کھچڑی پکتی رہی۔ نہیں میں قدآور بنوں گی۔ اس کی پھوپھی عاطف جو خود گنوں کی گٹھلی ہے جس نے کانٹوں میں الجھ کر زندگی بسر کرنا سیکھ رکھا ہے۔ ان انڈر گراؤنڈ گوریلوں کی لیڈر ہے جسے نیلم کی صلاحیتوں کا شعور ہے۔

اب پندرہ سال بعد نیلم کو موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ اس کی خوابیدہ صلاحیتوں نے انگڑائی لی ہے اور اب وہ بڑی دیدہ دلیری سے گزرے ہوئے نامساعد حالات اور واقعات کا بدلہ لے رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ایک دن نیلم' احمد بشیر کے باوجود ادب کے میدان میں قدآور مصنفہ بن کر ابھرے گی۔

◆◆◆

مونچھ مروڑ

(ڈاکٹر ابدال بیلا)

سیانے کہتے ہیں' ہر شخص کی تین عمریں ہوتی ہیں۔ جسمی' ذہنی' جذباتی۔

عام طور پر ان تینوں میں ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

انسانی شخصیت کی ہوری میں یہ پہلی رنگ پچکاری ہے۔

ابدال بیلا کی جسمی عمر چونتیس پینتیس سال ہے۔ اس کی ذہنی عمر کسی صورت میں ساٹھ سے کم نہیں اور جذباتی عمر کوششوں کے باوجود سولہ سال سے آگے نہیں جا سکی۔

ظاہر ہے کہ اس کی شخصیت میں ایک بے ربط محفل سجی ہوئی ہے۔ ایک طرف مونچھ مروڑنے والا جوان ہے' دوسری طرف سوچوں کا مارا ہوا دانا پردانا ہے اور تیسری طرف ایک کھلنڈرا منہ زور بچہ۔

پتہ نہیں ان تینوں کی آپس میں کیسے نبھ رہی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک انوکھا سازینہ بج رہا ہے۔ ایک ساز کی لے درت ہے دوسرے کی بلمپت' تیسرے کی پاپ۔

ابدال بیلا کو باہر سے دیکھو تو ایک پہلوان کھڑا ہے۔ ماجھے کا راجپوت مونچھ مروڑ رہا ہے۔ ایک لیڈیز مین گلیڈ آئی چمکا رہا ہے۔ مسکا رہا ہے۔ ایک فوجی جوان وطن کی محبت میں سرشار منتظر ہے کہ کب جہاد کا حکم ملے۔ جوائنٹ فیملی کا سردار طرہ لگائے استادہ ہے' جس کے حکم کے بغیر پتا نہیں مل سکتا۔

قریب جاؤ تو نہ وہ پہلوان رہتا ہے' نہ ماجھے کا ''جٹ'' ایک ذہنی آدمی ہے' سوچوں میں ڈوبا ہوا۔ گردوپیش منصوبوں کے جالے تنے ہوئے ہیں۔ ادبی منصوبے' سماجی منصوبے' ثقافتی منصوبے۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ منصوبے ذات سے تعلق نہیں رکھتے۔ معاشرے سے متعلق' پاکستان سے متعلق۔ باہر سے دیکھو تو لگتا ہے کہ بیلا ایک فیکیڈ ہے' عالی شان فیکیڈ' صرف فرنٹ ہی فرنٹ۔ جس کے اندر کچھ نہیں ہے بلکہ اندر وجود ہی نہیں رکھتا۔ صرف باہر ہی باہر

ہے۔ عجیب بات ہے کہ اندر کی روشنی باہر تک نہیں پہنچتی۔ کیسے پہنچے؟ باہر ہنڈوں کی جگمگ ہے۔ اندر مٹی کے دیئے کی لو باہر کی جگمگ میں سہمی سمٹی رہتی ہے۔

ابدال بیلا کے اندر باہر ایسا تضاد ہے جیسے تربوز میں ہوتا ہے۔ باہر ہرا کچور اندر لال سوہا۔

یہ اندر باہر کا تضاد ہی شخصیت کی سج دھج ہے۔ یہی رونق خانہ ہے۔ یہی مسرت بھرے قہقہے ہیں۔ یہی دکھ بھرے آنسو اور ٹھنڈی آہیں ہیں۔

پرانے قلمکار بڑے سیانے تھے۔ وہ شخصیت کی بھول بھلیوں میں قدم نہیں رکھتے تھے۔ اس پر زم کی ہفت رنگی کی بات نہیں کرتے تھے۔ بلکہ باہر کھڑے ہو کر جائزہ لیتے تھے۔ جبھی انہوں نے شخصیت کو خاکہ نگاری کا نام دے رکھا تھا کہ قد کیسا ہے جسم بھرا بھرا ہے یا سکڑو۔ قلم کون سی جیب میں رکھتے ہیں۔ ڈسک پر بیٹھ کر لکھتے ہیں یا میز پر۔

مطلب ہے صرف آؤٹ لائن ہی آؤٹ لائن۔ لکیریں ہی لکیریں۔ اندر کی گھمن گھیریاں نہیں' باہر کی آڑی ترچھی لکیریں۔

ابدال بیلا کی باہر کی لکیریں دیکھو تو عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے مشہور گیت کا بول مجسم سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

''تینوں چک کے لے جانا میانوالی' تینوں چک کے''

یہ گورکھ دھندا مجھ پر ۱۹۷۹ء میں نازل ہوا۔

نزول کی تفصیلات یوں ہیں کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک روز ڈاک سے مجھے ایک کتاب موصول ہوئی۔ ایک خط ملفوف تھا۔ لکھا تھا۔ یہ میرے شائع شدہ افسانوں کے پہلے مجموعے کی پروف کاپی ہے۔ جب تک آپ اس پر اپنی رائے قلمبند نہیں کریں یہ کتاب شائع نہیں ہوگی۔

واہ' کیا انوکھی دھونس ہے۔ میں نے سوچا۔

نئے افسانہ نویسوں کی جانب سے مطالبات تو اکثر موصول ہوتے رہتے تھے لیکن ایسی کھلی دھونس کبھی موصول نہ ہوئی تھی۔

دوسری عجیب بات یہ تھی کہ کتاب کے وہ پروف کھلے کاغذات کی شکل میں نہ تھے۔ انہیں کتاب کی شکل میں سی کر جلد بندی کی ہوئی تھی۔ یا اللہ اتنا اہتمام۔ ایک طرف جذبے کی شدت دوسری جانب کر دکھانے والا عمل۔

خط کے نیچے ابدال بیلا کے ساتھ طالب علم فائنل ائیر ایم بی بی ایس دیکھ کر میرا فلوس اڑ گیا۔ یا اللہ یہ ابدال بیلا کیا چیز ہے۔ ایم بی بی ایس کا آخری سال تو سر کھجانے نہیں دیتا۔ اور یہ میاں افسانہ نویسی اور مجموعہ بازی کے اہتمام میں لگے ہوئے ہیں۔

بہرطور ایک بات سمجھ میں آ گئی کہ اس شخص کو ٹرخانہ آسان کام نہیں۔ کہانیاں پڑھیں تو حیرت ہوئی۔ سیدھی سادی کہانیاں ۔۔۔۔۔۔۔۔ایک تھا بادشاہ‘ اس کی تھی ایک رانی‘ نہ علامت نہ تجرید‘ نہ کھوج لگاؤ‘ نہ راستہ تلاش کرو۔

ابدال بیلا کی شخصیت کے متعلق میرے ذہن میں کھچڑی سی پک گئی۔ ماڈرن بھی ہے۔ روایت بھی ہے۔ خوابوں کا مارا ہوا ہے۔ سراسر عمل بھی ہے۔ کہانیوں میں بڑی جان ہے۔ انداز بیان میں خود اعتمادی ہے۔ پبلک ریلیشنز کا یہ عالم ہے کہ طالب علمی کے دور میں پبلشر کو پھنسایا ہے اور وہ بھی صف اول کا پبلشر۔

جذبے میں شدت ہے۔ پلاننگ میں دور اندیشی ہے۔ عقیدت کا قوام بڑا گاڑھا ہے اور ساتھ دھونس بھی ہے۔

یا اللہ یہ ابدال کیا چیز ہے؟

ابدال بیلا سے پہلی ملاقات پر میں چکرا گیا۔

میرے روبرو ایک اجنبی کھڑا تھا۔ مونچھیں تنی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے لگاؤ کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ کہنے لگا‘ میں ابدال بیلا ہوں۔

مجھے یقین نہ آیا۔ سمجھا کوئی بہروپیہ ہے۔

پہلی بات یہ تھی کہ ایسے حلیے والا میرا کوئی دوست نہ تھا بلکہ ایسے حلیے والا شخص میرا دوست ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ دیر تک ہم دونوں کے درمیان اجنبیت کا دبیز پردہ پڑا رہا۔ پھر اس کی باتوں نے آہستہ آہستہ برف پگھلائی۔

جب ہماری بے تکلفی ہوئی تو میں نے پوچھا۔ میں نے کہا۔ ’’ایک بات بتاؤ۔ تم نے اپنی کتاب ’’گڈمڈ‘‘ تبصرے کے لیے مجھے کیوں بھیجی تھی؟ میں تو نقاد نہیں ہوں۔‘‘

بولا ’’ساری شرارت لبیک کی تھی۔ مجھے لبیک ہوگئی تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں لبیک کے مصنف سے ضرور ملوں گا۔ اینڈ ہیر آئی ایم۔‘‘

’’تمہیں لبیک کیسے ہوگئی تھی۔‘‘ میں نے پوچھا۔

بولا ’’پتہ نہیں‘ اتفاق سے ہاتھ لگ گئی۔ پڑھی تو چمٹ گئی۔‘‘

ان دنوں میں ہوسٹل کی ڈارمیٹری میں رہتا تھا۔ وہاں لیٹ نائٹ شوقیہ مطالعہ مناسب نہ تھا۔ اس لیے میں اسے گریز اناٹومی میں چھپا کر پڑھتا رہا۔ جیسے محبوبہ کا خط پڑھ رہا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے آنسو نکل آئے۔ پھر دو تین کراہیں نکل گئیں۔ ڈرامیٹری کے لڑکے

حیرت زدہ ہو گئے۔ ارے یہ بیلا کو کیا ہوا۔ گریز انا ٹومی پڑھتے ہوئے آنسو بہا رہا ہے' کراہ رہا ہے۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ پھر لبیک میں جب وہ باب آیا جہاں اللہ مسجد حرام کے باہر کھڑا لوگوں کی منتیں کرتا ہے کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ اللہ ڈرامیٹری میں آ گیا۔ بولا' آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں نے کہا' ذرا ٹھہرو۔

میں نے وضو کیا۔ کپڑے بدلے' خوشبو لگائی اور اللہ کی انگلی پکڑ لی۔

وہ مجھے قریبی مسجد میں لے گیا۔

دن چڑھے واپس آیا تو لڑکے پوچھنے لگے۔ ''ابے او ڈان جان کے بچے! یہ والی نئی محبوبہ کون سی ہے جسے ملنے گئے تھے' آدھی رات کے وقت۔ پہلے غسل کیا' پھر کپڑے بدلے' خوشبو لگائی۔ ہم کانی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔''

ابدال بیلا پلسی دیانت' اینٹی فیملی پلاننگ' ایڈونچر اور عشق کی پیداوار ہے۔

دو آبے کے اونچے لمبے' سوا چھ فٹ مونچھ مروڑ خاندان کا فرد ہے۔ بزرگوں کو کثرت اولاد کی بیماری لاحق تھی۔ نانا کے ۷ بھائی تھے۔

والد فوت ہوئے تو ترکہ میں پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں اور ایک ڈبل بیرل بارہ بور بندوق چھوڑ گئے۔

بیلا کے والد آباءواجداد سب پلسیئے تھے۔

والد چالیس سال پولیس کی نوکری کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب پولیس میں اسلام اور دیانت کی بیماری عام تھی۔ آج کل تو اللہ کے فضل سے پولیس صحت مند ہو چکی ہے۔ کچھ زیادہ ہی صحت مند۔

اس زمان میں تفتیشی حوالدار تفتیش پر دیہات میں جاتا تو مٹی کے لوٹے میں آٹا اور گڑ کی بھیلی ساتھ لے جاتا تھا۔ مسجد کے حجرے میں قیام کرتا تھا۔ مونچھ مروڑ کر باہر نکلتا تو غنڈے تھر تھر کانپتے تھے۔ یہ تھر تھر کانپنا حوالداری یا قد کاٹھ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ لوٹا بھر آٹا اور گڑ کی بھیلی کی وجہ سے تھا۔

آج بھی دیانتدار افراد پولیس میں ملتے ہیں۔ خال خال ہی پر ہیں۔

پتہ نہیں اللہ کا یہ کیسا دستور ہے کہ غلاظت سے ہرا بھرا بوٹا اگاتا ہے شر کے ڈھیر سے خیر کا پھول کھلاتا ہے۔ مجھے ایک ایسے ایس ایچ او سے ملنے کا اعزاز حاصل ہے جس کا گھوڑا مفت کی گھاس کو منہ نہ لگاتا تھا۔

ابدال بیلا اس دور کے پولیس تھانوں میں پل کر جوان ہوا ہے۔ باپ کے ساتھ تفتیش پر جانا اس کے لیے بڑی عشرت تھی۔ پیدل چلنا۔ لوٹے کے آٹے کی روٹی گڑ کے ساتھ کھاتا اور مونچھ مروڑتا۔

ابدال بیلا کو عشق ورثہ میں ملا ہے۔

والد ساری زندگی بری طرح عشق میں سرشار رہے۔ اپنا سارا کیرئیر عشق کی بھینٹ چڑھا دیا۔ افسر محبوبہ کے طعنے دیتے رہے۔ انہوں نے چودھری فضل دین کی ترقی بند کر دی۔ چودھری نے کہا' کچھ پروا نہیں۔ بر چشم قلندر۔ محبوبہ جان کی قربانی مانگے تو وہ بھی حاضر ہے۔ یہ محبوبہ بی بی مسلم لیگ تھی۔ جس کا عشق چودھری فضل دین کے سر پر زندگی بھر سوار رہا۔ ابدال بیلا کو وراثت میں جو عشق ملا اس کی کوئی سمت نہ تھی۔ خالی خولی عشق۔ صرف شدت ہی شدت۔ مجنونانہ نہیں' فرہادی عشق۔

سب سے پہلا دورا اس وقت پڑا جب بیلا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے چار ایک نہریں کھودیں۔

گمان غالب ہے کہ بیلا عشق کے دروازے سے ایوان ادب میں داخل ہوا۔ لکھنے کے شوق کی ابتدا لو لیٹرز سے ہوئی۔ بیلا لو لیٹر لکھنے میں اپنے وقت کا ابوالکلام جمع ابوالاثر ہے۔ اس کے عشقیہ خطوط کے سامنے مثنوی ''زہر عشق'' کی کوئی حیثیت نہیں۔ جن لڑکیوں کو بیلا نے لو لیٹر نہیں لکھے انہیں اللہ کے حضور دو نفل شکریہ کے ادا کرنے چاہئیں۔ کالج میں بیلا پہلے تو مضمون نگاری کے پردے میں عشق جھاڑتا رہا پھر اس پر انکشاف ہوا کہ کہانی کے پردے میں بھی لو لیٹر لکھا جا سکتا ہے۔

گورنمنٹ کالج میں مرزا منور اور مشکور حسین یاد جیسے اساتذہ ملے۔ سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ ''راوی'' کا نائب مدیر بن گیا۔

میڈیکل کالج میں کو۔ ایجوکیشن تھی' لہٰذا کھل کھیلا۔ ایک جانب عشق دوسری جانب ادب۔ دونوں کو پہیئے لگ گئے۔ قمیضوں پر لپ اسٹک کے نشان بھابیوں سے چھپ چھپ کر خود ہی دھوتا رہا۔

جوں قمیضوں پر نشانات شوخ ہوتے گئے توں توں کہانیاں ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' میں توجہ طلب ہوتی گئیں۔ ہاؤس سرجن ہوا تو ''نوائے وقت'' میں خبر چھپی۔ ''خدا جانے بیلا کے کس ہاتھ میں قلم ہے اور کس ہاتھ میں نشتر''

سارا اعجاز لو لیٹرز کا تھا۔ صاحبو! آپ ان لو لیٹرز کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں وہ بدقسمت ہوں جو لگا سکتا ہوں۔ ۱۹۸۴ء میں گنگا رام کے ایمرجنسی وارڈ میں بیلا نے ایک مریضہ کی نبض پر ہاتھ رکھا تو اپنی نبضیں چھوٹ گئیں۔

پھر لو لیٹرز کا ایک طوفان آ گیا۔

آپ جانتے ہیں کہ عشق کے مارے ہوئے کو ایک رازدان کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ میری بدقسمتی کہ بیلا نے اس کار خیر کے

لیے مجھے چن لیا۔ زبردستی!

پہلا راز نامہ جو مجھے موصول ہوا وہ محبوبہ کے خدوخال کے بارے میں تھا کہ ناک کیسی ہے۔ آنکھ کیسی ہے۔ نگاہ کی دھار کتنی تیز ہے۔ بولتی ہے تو کس طرح پھول جھڑتے ہیں۔ مسکاتی ہے تو کتنے وولٹ بجلی کی کرنٹ جنریٹ ہوتی ہے۔ یہ خط سراپا پر محدود تھا۔ پورے گیارہ فل اسکیپ لیٹر پیپرز پر یہ سراپا کہانی لکھی ہوئی تھی۔

دوسرا خط صرف بالوں پر تھا۔ کتنے لمبے ہیں۔ کتنے چمکیلے ہیں۔ لٹیں کیسے الجھتی ہیں۔ نگاہیں ''سلجھا جا'' کی دعوت دیتی ہیں۔ مجھے تو دس دس صفحات کے راز نامے آتے تھے۔ محبوبہ کو چار چار لیٹر پیڈوں کے خط موصول ہوتے تھے۔

اپنا تو یہ عالم تھا کہ خط پڑھ کر جی چاہتا کہ دنیا تیاگ کر پہاڑ کے کسی ڈھلان پر کٹیا میں جا رہوں اور باقی زندگی اللہ اللہ کر کے گزار دوں۔ پتہ نہیں محبوبہ کی کیا حالت تھی۔

سیانے کہتے ہیں کہ جب عاشق چھ فٹی مونچھ مروڑ ہو اور مجسم ''تینوں چک کے لے جاناں اے میانوالی'' ہو تو ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سچ کہتے ہیں۔ محبوبہ اس وقت بیلا کی بیوی ہے۔

صاحبو! مجھے ہر اس خاتون سے بے پناہ ہمدردی ہے جو محبوبہ سے بیوی بن جاتی ہے' بیچاری! ۔۔۔۔۔۔۔۔ دو ایک برس جذبات کی جگمگ کی چکا چوند میں رہنے کے بعد باقی ساری زندگی لالٹین کی ٹم ٹم روشنی میں بسر کرنی پڑتی ہے۔

◆◆◆

ٹھنڈا میٹھا

(آغا ناصر)

کھانے پینے کے زاویے سے دیکھا جائے تو شخصیتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ مرچیلی' میٹھی اور بے سوادی۔

مرچیلی ڈنک مارتی ہے' سوئی کی طرح چبھ جاتی ہے' نمائشی لشکارے مارتی ہے' توجہ طلب ہوتی ہے' میری طرف دیکھو' میری بات سنو۔

میٹھی Passive ہوتی ہے۔ کرنے کا نہیں' سہنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اندر جذبات کی بھیڑ لگی ہوتی ہے' زبان پر تالہ لگا ہوتا ہے۔ غصہ بھڑک کر نہیں آتا۔ بھٹیاری اندر چڑ چڑ دانے بھونتی رہتی ہے۔ چمک نہیں مارتی۔ مٹی کے دیئے کی طرح روشنی دیتی ہے۔ مدھم مدھم۔

بدقسمتی سے آغا ناصر کی شخصیت ٹھنڈی میٹھی ہے۔ اور صاحبو! آج کل ٹھنڈی میٹھی کو کون پوچھتا ہے۔ ٹھنڈی میٹھی سے تو لوگ بیاہ کرنے سے بھی منکر ہیں۔ آج کل تو ڈنک چلتا ہے۔ ڈنک نہ ہو تو کم از کم بھڑ جیسی بھوں بھوں تو ہو۔

نقل ہے کہ مسجد میں وعظ ہو رہی تھی۔ مولوی صاحب تلقین کر رہے تھے کہ لوگو ڈنک نہ مارو' کاٹو نہیں۔ اتفاق سے مسجد میں ایک سانپ بھی موجود تھا۔ اس نے سچے دل سے کاٹنے سے توبہ کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد مولوی صاحب جنگل میں جا رہے تھے' انہوں نے دیکھا کہ ایک چمکدار ریشمی رسی سرراہ پڑی ہے۔ قریب گئے تو دیکھا کہ رسی نہیں سانپ ہے۔

''ارے یہ حال تیرا کیسے ہوا؟'' مولوی صاحب نے سانپ سے پوچھا۔

سانپ بولا۔ ''حضور کا وعظ سنا تھا' آپ نے فرمایا تھا کہ کاٹنا چھوڑ دو۔ سو میں نے چھوڑ دیا۔ اب لوگ مجھے رسی سمجھتے ہیں' بچے ٹھڈے مارتے ہیں' فٹ بال کھیلتے ہیں۔''

مولوی بولا۔ ''میں نے تو تجھے کاٹنے سے منع کیا تھا' یہ تو نہیں کہا تھا کہ پھنکارنا بھی چھوڑ دے۔''

آغا ناصر کی شخصیت میں نہ ڈنک ہے نہ پھنکار۔

شاید دبے ہوئے غصے کی چڑ چڑ ہو۔لیکن اس کی تصدیق تو صرف بیگم کر سکتی ہیں۔اور ان کی بیگم تو بھید رکھنا جانتی ہیں' کھولنا نہیں۔

آغا ناصر سے میری پہلی ملاقات ہی گڑ بڑ گھوٹالہ ہوگئی۔

میرے ایک دوست ہیں محمد عمران کی طبیعت میں شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر بات چیخ کر کہنے سے کام چل جاتا ہے تو دھیمی آواز میں کہنے کا فائدہ۔

عمر نے ایک دن مجھے فون کیا' کہنے لگے۔''یار میرے گھر آجا۔ابھی ابھی' فوراً

میں نے پوچھا۔''کس خوشی میں؟''

بولا''میں تجھے اپنے ایک عزیز دوست سے ملانا چاہتا ہوں۔''

عمر کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک صاحب بیٹھے ہیں۔چوڑا چکلا' گورا چٹا چہرہ' آنکھ دیکھنے والی نہیں بلکہ دکھنے والی اور جاذب' نگاہ پی جانے والی اور چٹے سفید چہرے پر لہریں لیتی ہوئی سرخی۔جھینپ کی سرخی۔

آغا ناصر نے بات کی تو مٹھاس کی اک پھوار اڑی۔بھیگ ہی بھیگ۔پھر ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی۔

صاحبو! آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں ''ہم'' تہذیب سے خوف زدہ ہوں۔خود کو میں کی بجائے ہم کہنے والوں سے ڈرتا ہوں۔میری دانست میں آج کے دور میں سب سے بڑی مشکل ''میں'' ہے جس کو دیکھو وہ گردن اکڑا کر میں میں کرتا پھرتا ہے۔جو لوگ میں میں مزید ٹیمن بھر کر خود کو ہم کہتے ہیں ان سے ڈر لگنا قدرتی امر ہے۔

لیکن آغا ناصر کی بات نرالی تھی۔وہ خود کو ہم تو کہہ رہے تھے لیکن اس میں ہم کی ٹین نہیں تھی۔الٹا ان کا ہم تو میں سے بھی کمزور تھا۔لیکن یہ سب باتیں اس نیک آدمی پر عائد ہوتی ہیں جسے احساس ہو کہ میں نیک آدمی ہوں۔قصور احساس کا ہے' نیکی کا نہیں۔آج کل تو نیکی چھپا کر رکھنے کی چیز ہے۔ظاہر نہ ہونے پائے۔

''یاد حق دل میں رہے انداز رندانہ رہے''

آغا ناصر کو پتہ ہی نہیں کہ وہ نیک آدمی ہے لیکن دقت یہ ہے کہ وہ نیک آدمی دکھتا ہے' بھید کھل جاتا ہے۔

بنیادی طور پر آغا ایک تخلیق کار ہے' ادیب ہے۔اس نے اپنے کیرئیر کے آغاز ہی میں تحریر و تصنیف کے شغل کو اپنا لیا تھا۔اس کی تحریروں میں جان تھی۔لگتا تھا کہ پہنچنے والوں میں سے ہے۔پھر بدقسمتی سے اس کی آنکھ پی ٹی وی ٹیلیویژن سے لڑ گئی۔بس کباڑا ہو گیا۔

''شوبز'' والے جانتے ہیں کہ ٹیلیویژن ایک محبوبہ ہے' جگت محبوبہ۔اس کے دو رخ ہیں۔باہر سے دیکھو تو گلیمر ہی گلیمر۔اندر

مشقت ہی مشقت۔ ایسی مشقت جو تخلیق کی صلاحیتیں سلب کر لیتی ہے۔

بے شک ٹیلیویژن شہرت دیتی ہے لیکن صرف باہر کے لوگوں کو اندر بلیک آؤٹ ہی رہتا ہے۔

ٹیلیویژن چلانے کے لیے ذہن اور سوچ والے افراد کو چنا جاتا ہے۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ خبردار اپنی عقل کو کام میں نہ لانا۔ جی حضوریے بن کر کام کرنا۔

دراصل ہم سمجھتے ہیں کہ ٹی وی اظہار کا ایک میڈیا ہے۔ بہت کم لوگ اس بھید سے واقف ہیں کہ ٹیلیویژن دودھ دینے والی بھینس ہے اور جو بھی لاٹھی والا آتا ہے اسے ہانک کر لے جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ٹیلیویژن ایک ایسا ادارہ ہے جس پر ہر ایک کی نظر ہے۔ سیانے کہتے ہیں' نظروں پر نہ چڑھو دلوں سے اتر جاؤ گے۔ بھانت بھانت کی بولیاں سہنی پڑیں گی' سننی پڑیں گی۔ رہی شہرت کی بات تو جناب والا ٹی وی کی شہرت کی قندیل نہیں جلاتی وہ تو بھانبھڑ لگانا جانتی ہے۔ بھانبھڑ کی خصلت ہے کہ بھڑ بھڑ جلتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس شہرت تو مٹی کی ہانڈی میں دھیمی آنچ پر پکتی ہے۔ سچ پکے سو میٹھا ہو۔ میرے چند ایک دوستوں نے ٹی وی پر بھانبھڑ لگایا اور اب راکھ کے ڈھیر پر بیٹھے ماضی کی یاد میں آہیں بھر رہے ہیں۔

ٹیلیویژن کا گلیمر آغا کو بہت مہنگا پڑا۔ ایک تو ان کی تخلیقی صلاحیتیں جہاں دھری تھیں' دھری رہیں' زنگ آلود ہو گئیں۔ دوسرے انہیں قیام سے محروم کر دیا گیا۔ ساری عمر ٹی وی کی گلی کے پھیرے لگاتے گزر گئی۔ آئے گئے' آئے گئے۔

آغا ناصر کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے سلسلے کی وجہ سے ملا۔ سلسلہ بڑے افسروں کی ایک ادبی تنظیم تھی۔ قدرت اللہ شہاب مجھے سلسلہ کی ایک محفل میں مہمان کی حیثیت سے لے کر گئے تھے۔ ادا جعفری نے پتہ نہیں کیوں مجھے رکنیت سے نواز دیا۔ یوں راج ہنسوں کی محفل میں ایک کوا جا بیٹھا۔

سلسلہ میں جمیل نشتر تھے' مختار مسعود تھے' مسعود مفتی تھے' نور الحسن جعفری تھے' آغا ناصر تھے' قدرت اللہ شہاب اور بیگمات تھیں۔ بڑے عہدے داروں اور اصحاب اقتدار کا جو ادب سے ناطہ ہے اس کے بارے میں میں خوشگوار رائے نہیں رکھتا' معافی چاہتا ہوں۔

میری دانست میں بڑے لوگوں کے لیے ادب ایک بناوٹ سجاوٹ کی چیز ہے۔ جس طرح پاکستانی کلچر کو ڈرائنگ روم میں سجاتے ہیں اسی طرح وہ اپنے شلفوں کو ادبی کتابوں سے ڈیکوریٹ کرتے ہیں۔

وہ ادب میں Participate نہیں کرتے صرف Apperciate کرتے ہیں اور اس Appreciation میں Participation کی جھلک واضح ہوتی ہے۔ اچھا' بہت اچھا۔ شاباشے' تالی بجاؤ۔

میرا خیال تھا کہ سلسلے میں ایسا ہی منظر دیکھنے میں آئے گا۔لیکن میرا خیال غلط نکلا۔سلسلہ کے ارکان افسری کا چغہ اتار کر محفل میں آتے تھے۔اس لیے قریب سے دیکھنے کے مواقع موجود تھے۔صرف دیکھنے والی آنکھ کی شرط تھی۔

آغا کو قریب سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اندر سے سراسر کامی ہے۔لیکن اس کامی نے اپنی تمام تر صلاحیتیں پروفیشن کے قدموں میں بھینٹ کر رکھی ہیں اور قریب سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ادبی صلاحیتیں زنگ آلود نہیں' صرف گرد آلود ہوئی ہیں۔

سلسلہ میں تین سال کے دوران میں ارکان کے دباؤ اور واہ واہ کے زیر اثر آغا نے چار چھ مہینے ایسے افسانے تخلیق کئے کہ ایک منجھا ہوا کہانی کار سامنے آ کھڑا ہوا۔

بے شک آغا میں ایک منجھا ہوا افسانہ نگار موجود ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ باہر آنے سے گھبراتا ہے' کتراتا ہے۔اتنی یقین دہانیوں کے باوجود اسے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ وہ ایک منجھا ہوا افسانہ نویس ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اب کی بار آغا افسانوں کا مجموعہ پیش کریں گے لیکن ٹی وی کی لگن ادب کی طرف آنے بھی دے۔''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی''

دیکھ لیجئے' اب بھی وہ ٹی وی کے ڈرامے لے کر آئے ہیں۔کیا تماشا ہے کہ ہاتھ میں لڈو موجود ہے پھر بھی گڑ کھانے پر مصر ہیں۔

جناب والا ادب میں خود اعتمادی سے متعلق آغا کی کیفیت ایسی ہی ہے جیسے مہاراج کی تھی۔

مہاراج کہیں جانے کے لیے محل سے باہر نکلے۔دفعتاً انہیں خیال آیا کہ پگڑی تو سر پر رکھی ہی نہیں۔خادموں کو حکم دیا کہ جاؤ محل سے ہماری پگڑی ڈھونڈ کر لاؤ۔خادموں نے سارا محل چھان مارا' پگڑی نہ ملی۔پھر اتفاقاً ایک خادم کی مہاراج کے سر پر نظر پڑی تو وہ بولا۔''مہاراج پگڑی تو آپ کے سر پر ہے۔''

مہاراج بولے۔''اچھا کیا کہ ہمیں بتا دیا ورنہ ہم ننگے سر ہی وہاں پہنچ جاتے۔''

تو جناب والا آغا کو ایسے ساتھی کی ضرورت لاحق ہے جو اسے یاد دلاتا رہے کہ بھئی پگڑی تو تیرے سر پر ہے۔

◆◆◆

کامی

(ڈاکٹر انور زاہدی)

اگر آپ ڈاکٹر انور زاہدی کو جاننا چاہتے ہیں تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس سے ملئے نہیں بلکہ اسے پڑھئے۔

کتنی عجیب بات ہے لیکن کتنی سچی!

کچھ شخصیتیں حلوائی کی دکان کی طرح ساری کی ساری باہر دھری ہوتی ہیں۔ کچھ فیصل مسجد کی طرح ہوتی ہیں۔ باہر ایک روکھا پھیکا خیمہ تنا ہوتا ہے جسے دیکھ کر پتہ نہیں چلتا کہ اندر رنگ رس کا میلہ لگا ہوا ہے۔

انور زاہدی کی شخصیت بھی باہر سے ایسی ہی روکھی پھیکی ہے۔

اسے ملئے۔ آپ کے روبرو ایک سو فیصد Extrovert فرد کھڑا ہوگا۔ ایک فعال فرد۔ ایک حقیقت پسند ایک دو اور دو چار گننے والا۔ ایک دوڑ بھاگ کامی۔ پرانے زمانے کا ایک فیملی ڈاکٹ اور بس۔ یوں جیسے اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔

اس کی شخصیت کی باہر کی خصوصیات اس کی اندر کی خصوصیات کو جھٹلاتی ہیں اور اندر کی خصوصیات باہر کے اوصاف کی ضد ہیں۔

مجموعی طور پر اس کی شخصیت ایک حیران کن مجموعہ اضداد ہے جیسے مظفر آباد میں دریائے جہلم اور دریائے نیلم کا سنگم ایک حیران کن مجموعہ اضداد ہے۔ ایک طرف دریائے جہلم کا میلا گدلا شوریدہ سر دھارا آتا ہے دوسری جانب سے دریائے نیلم کا صاف شفاف برفیلا مدھم رو دھارا آتا ہے۔ دونوں ملتے ہیں اور دور تک دونوں دھارے ساتھ ساتھ مگر الگ الگ بہتے ہیں۔

ہمارا خالق اپنی تخلیق کو دیکھتا ہے بڑے مان سے دیکھتا ہے۔ اپنے ہاتھ چومتا ہے۔ ہم سے کہتا ہے دیکھو تو میں نے کیا کیا بنایا ہے دیکھو تو۔ تم دیکھتے کیوں نہیں۔ دیکھو کہ ہم نے دو سمندر آپس میں ملا دیئے ہیں۔ ایسے کہ ایک کا پانی دوسرے سے نہیں ملتا۔ ملے ہوئے بھی ہیں الگ الگ بھی ہیں۔

ایسے ہی ڈاکٹر زاہدی کی شخصیت کے دو دھارے ہیں۔ ایک جانب ایکسٹروورٹ بہہ رہا ہے دوسری جانب انٹروورٹ۔ ملے ہوئے بھی ہیں الگ الگ بھی ہیں۔ ایک دوسرے کو رد نہیں کرتے۔

باہر کا زاہدی Extrovert ہے' ایک حقیقت پسند۔ دو اور دو چار گننے والا' پریکٹیکل۔

اندر کا زاہدی خواب دیکھنے والا فرد ہے۔

باہر کا سوشل ہے' لوگوں سے ملنے گلنے والے' دوڑ بھاگ کا متوالہ۔

اندر کا اکیلا ہے' تنہا' منفرد' تخلیق کار۔

اور یہ دونوں ایک ہی جسم میں رہتے ہیں۔ لڑتے نہیں' جھگڑتے نہیں۔

صرف زاہدی کی بات نہیں انسانی شخصیت ایک حیرت کدہ ہے۔

ایک طرف آگ اور پانی گلے مل رہے ہیں۔ دوسری طرف حرکت اور جمود مصافحہ کر رہے ہیں۔

ادھر شدت کا دھارا بہہ رہا ہے جس میں صبر و تحمل اور احتیاط کے جزیرے ابھرے ہوئے ہیں۔ ادھر شر کا لق و دق صحرا پھیلا ہوا ہے جس میں یہاں وہاں خیر کے ہرے بھرے نخلستان لہرا رہے ہیں۔

قدرت شعبدہ باز کی طرح ان تضادات کو جوڑ جوڑ کر ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ وحدت سے کثرت نکالتی ہے' کثرت سے وحدت پیدا کرتی ہے۔

کیا وجد آفرین تماشا ہے۔

کیا عظیم تخلیق کار ہے۔

زاہدی ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے۔

ایم بی بی ایس کو لکھنے کی جانب مائل دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ایم بی بی ایس ڈاکٹر کی زندگی دو ادوار میں بٹی ہوتی ہے۔ پہلے کئی ایک سال جب وہ جونیئر ڈاکٹر ہوتا ہے اور آخری ایک سال جب وہ سینئر اسپیشلسٹ ہوتا ہے۔

جونیئر دور میں وہ ایک چاکر ہوتا ہے۔ مسلسل کام مسلسل خدمت مسلسل جی حضوری!

اسپیشلسٹ دور میں وہ مسلسل پیسہ کمانے کی مشین بن جاتا ہے۔ افلوانس اسے بے حس بنا دیتی ہے۔

دونوں صورتوں میں ادب اور فن آؤٹ آف باؤنڈ ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی ایک ایم بی بی ایس ادبی میدان میں آئے۔ تخلیق کے ذوق کے راستے میں ڈاکٹری کی مجبوریاں سدِ راہ نہ بن سکیں۔

سب سے پہلے ڈاکٹر شفیق الرحمٰن آیا۔ اس نے تخلیق کی ایسی ایسی پھلجڑیاں چلائیں کہ ہلچل مچ گئی۔ اتنی شہرت حاصل کی جو اس

زمانے میں صرف فلمی ہیروئین کو ملتی تھی۔ ایک دہائی تک شفیق نوجوانوں کے ذہنوں پر چھایا رہا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ڈاکٹری کے پیشے میں طمع نے غدر نہیں مچایا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ان دنوں کالج کی کوئی ٹین ایجر اپنے سرہانے تلے شفیق کی کتاب رکھے بغیر سوتی نہیں تھی۔

ڈاکٹر شفیق کی تخلیقات مزاح اور رنگینی سے سرشار تھیں پھر بدقسمتی سے اس نے شادی کر لی۔ بیگم آہنی عزم کی مالک تھیں۔ شفیق طبیعت کے نرم اور میٹھے تھے۔ اس ملاپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بتاشے کی گھل گئے۔

اب بھی ادبی میدان میں کئی ایک ایم بی بی ایس موجود ہیں۔

ڈاکٹر انور سجاد ہیں' ایوب مرزا ہیں' آصف فرخی ہیں' ابدال بیلا ہیں۔ ڈاکٹر انور سجاد نے تجریدی افسانے کو اپنایا ہے۔ ان کی تخلیقات منفرد ہیں۔

ڈاکٹر آصف فرخی میں ادبی تفاخر کا جذبہ اس قدر شدید ہے کہ گمان غالب ہے کہ وہ تحقیق وتنقید کی بلندیوں پر ہی پرواز کریں گے۔ تخلیق کے میدان میں قدم رکھنے سے گریز کریں گے۔

ڈاکٹر انور زاہدی ادبی تفاخر سے یکسر خالی ہے۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے۔ ڈاکٹر زاہدی کے آباء میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ اس کے والد مقصود زاہدی نے وہیں تعلیم پائی۔ تقسیم سے پہلے ہی انہیں روزگار کے سلسلے میں پنڈی آنا پڑا پھر وہ کچھ عرصہ پشاور میں رہے اس دوران بٹوارہ ہو گیا اور وہ مستقل طور پر ملتان میں جا مقیم ہوئے۔ ڈاکٹر زاہدی کا بچپن ملتان میں گزرا اس نے وہیں تعلیم علم کیا۔

زاہدی خاندان کو میرٹھ چھوڑے پچاس سال ہو چکے ہیں۔ لیکن آج بھی وہ میرٹھ میں رہتے ہیں۔ سارا دن اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے اسلام آباد میں گھومنے پھرنے کے بعد ڈاکٹر زاہدی رات کو اپنے چھوٹے سے میرٹھ میں جا پناہ لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا میرٹھ بنا رکھا ہے جہاں روایت اور جدیدیت کی ہم آہنگی ہے' سکون ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ملتان یا پنڈی میں گھومتے ہوئے انہوں نے کبھی دوسروں کو احساس نہیں دیا کہ ہم ایک الگ کلچر کو belong کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے روایتی کلچر پر کبھی تفاخر کا اظہار نہیں کیا' نہ ہی اس پر شرمندگی محسوس کی ہے۔ یہ چھوٹا سا اطمینان وسکون بھرا میرٹھ جو انہیں حاصل ہے' ڈاکٹر زاہدی کے والد مقصود زاہدی کی وجہ سے ہے جنہوں نے گھر کو ایسے رنگ میں رنگ دیا ہے جسے نامساعد ماحول یا حالت بھی بے رنگ نہیں کر سکے۔

ادب اور مطالعہ اس چھوٹے سے میرٹھی خاندان میں یوں رچ بسے ہیں جیسے گندھے آٹے میں پانی۔

اپنے باپ کے حکم پر ڈاکٹر زاہدی نے شادی کی۔ بیگم صوبہ سرحد سے تھیں لیکن وہ شادی کے بعد اس چھوٹے سے میرٹھ کے رنگ میں ڈھل گئیں۔

ڈاکٹر زاہدی نے تخلیق کی صلاحیت ورثہ میں پائی ہے۔ آباء شیخ شہاب الدین حق گو کہلاتے تھے جن کا ذکر "تاریخ فرشتہ" میں ملتا ہے جن کے بڑھتے اثر ورسوخ سے خائف ہو کر محمد تغلق نے مروا دیا تھا۔ دادا وکیل تھے۔ والد کی پہلی ادبی تصنیف "ذکر وفکر" ۱۹۴۲ء میں میرٹھ میں شائع ہوئی تھی جس کا مقدمہ ساغر نظامی نے لکھا تھا۔

انور زاہدی پنڈی میں پیدا ہوا۔ پہلی نظم ساتویں جماعت میں لکھی۔ اسماعیل میرٹھی کی نظمیں زبانی یاد تھیں۔

چھوٹی بہن ماہ طلعت اردو ایم اے ہے اور بڑے پائے کی شاعرہ ہے۔

میں نے ڈاکٹر زاہدی سے پوچھا کہ آپ کی کہانیوں میں ہسپتال کی بو نہیں ہے' کیوں؟

صرف زاہدی ہی سے نہیں' مجھے تمام ڈاکٹر ادیبوں سے شکایت ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے پروفیشنل مشاہدات اور تجربات کو اپنے ادب پاروں کی بنیاد نہیں بنایا۔

ایسے ہی مجھے شاعرات پر بھی گلہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں شاعروں کی طرح صرف انسانی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ نسائی جذبات کا نہیں۔ حالانکہ مرد اور عورت کے جذبات اور حسیات میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔

مرد کے جذبات میں آندھی کی طرح پھیلاؤ ہوتا ہے' شدت ہوتی ہے۔ عورت کی حسیات میں گہرائی ہوتی ہے' دوام ہوتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ چھڑ جائے تو سارنگی کی تاروں کی طرح از خود چھڑی رہتی ہے۔ اس "چھڑ" میں اک لے ہوتی ہے۔ عورت کا دکھ ایک دھنکی ہوتی ہے جو رواں رواں کر دیتی ہے۔

نسائی جذبات صرف ٹھمریوں اور گیتوں میں ملتے ہیں۔ اردو غزل ان سے یکسر محروم ہے۔

مثلاً پنجابی میں نسائی جذبے کے اظہار کا ایک شعر ہے۔

جدوں ہولی جئی لیندا میرا ناں
میں تھاں مر جانی آں

ایسے ہی مجھے ڈاکٹر افسانہ نویسوں سے شکایت ہے کہ انہوں نے اپنی کہانیوں میں ہسپتال کے ماحول کو پیش نہیں کیا۔

میں نے ڈاکٹر ابدال بیلا سے پوچھا' میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ اپنے افسانوں میں ہسپتال کے مسائل کیوں پیش نہیں کرتے۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ بولا ''مثلاً ؟''

''مثلاً'' میں نے کہا۔ ''ہسپتالوں میں جو خواتین کے غول کے غول گھومتے پھرتے ہیں۔ مثلاً دوا ساز کمپنیوں کے زیر اثر ڈاکٹر ہیلتھ کنسرن کو ہوا دیتے رہتے ہیں جو جملہ بیماریوں سے زیادہ مہلک بیماری ہے۔ مثلاً مریض ڈاکٹروں کو استعمال کرتے ہیں' ڈاکٹر مریضوں کو۔ مسلسل ایک رسہ کشی لگی رہتی ہے۔ آپ ان موضوعات پر کیوں نہیں لکھتے۔

ڈاکٹر بیلا مسکرایا۔ ''ہمیں پروفیشن کی Diginity کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔''

''پھر آپ معاشرہ پر کیوں لکھتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''کیا معاشرے کی کوئی Diginity نہیں۔''

انور زاہدی کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری چوٹی کی افسانہ نویس خالدہ حسین ڈاکٹر افسانہ نویسوں کے متعلق لکھتی ہیں۔

''دنیا کا کوئی پروفیشن تخلیقی فن پر خصوصاً ادب پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ جس طرح ڈاکٹر ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ نہایت تفصیلی سطح پر جسمانی واردات سے واقف ہوتا ہے۔ انسانی وجود کے روم روم سے واقف ہے۔

مجھے لگتا ہے اسے چلتے پھرتے انسانی ڈھانچے نظر آتے ہوں گے یا پھر الماریوں میں لٹکے دل گردے پھیپھڑے شریانیں۔''

یہ لوگ بڑی آسانی سے گوشت پوست کی دنیا میں کھلنے والے ایک غیر مرئی دنیا کے دروازے کا پتہ رکھتے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ خالدہ حسین کا ہسپتال کے متعلق کانسپشن صرف اکسٹرنلز پر محدود ہے۔ اس سلسلے میں وہ ڈاکٹر انور زاہدی کی کہانی ''وہیل چیئر'' کو ہسپتالی کہانی کی نمائندہ کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

میری دانست میں ''وہیل چیئر'' کو ہسپتالی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کہانی میں زاہدی نے تین باتوں کا ذکر کیا ہے۔

ا۔ ہٹلر کا رپلیکا ایم ایس جو ہسپتال کا راؤنڈ کرتا ہے اور جس کے ساتھ جی حضوریوں کا ایک ٹولہ ہوتا ہے۔

۲۔ فزیوتھراپی کے ہال میں ایک سیٹھ جس نے اپنی مل میں مزدوروں پر گولی چلوائی تھی۔

۳۔ فنکار کی ناقدری۔

یہ تینوں مناظر ہسپتال سے مخصوص نہیں ہیں۔ ہر محکمہ میں ناظم اعلیٰ اسی انداز سے راؤنڈ کرتا ہے اور اس کے گرد ایسے ہی جی

حضوریوں کا ٹولہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دار سیٹھ اور نا قدری کا مارا ہوا فنکار بھی ہسپتال کی زندگی سے مخصوص نہیں ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ وہیل چیئر کو خالدہ ہسپتال کی نمائندہ کہانی کیسے سمجھتی ہیں۔

ہمارے ڈاکٹر افسانہ نویسوں نے کبھی ہاسپٹل ورکرز کی کہانی نہیں سنائی۔

انہوں نے کبھی ان مریضوں کا تذکرہ نہیں کیا جو اس لیے بیمار ہوتی ہیں کہ انہیں خاوند کی توجہ حاصل رہے۔ ان مریضوں کا تذکرہ نہیں کیا جو زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں اور بستر مرگ پر پڑے پڑے دفعتاً محبت کا ایک طوفانی جذبہ محسوس کر کے نرس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے والہانہ محبت کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان مریضوں کا ذکر نہیں کیا جنہیں آپریشن کروانے سے عشق ہے اور وہ ہزار بہانے کر کے ڈاکٹر کو آپریشن کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان ڈاکٹروں کا تذکرہ نہیں کیا جو صرف پیسہ کمانے کی غرض سے مریض کو ڈرا کر آپریشن کرانے پر راضی کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر زاہدی نے وہیل چیئر میں عام سے مسائل پیش کیے ہیں مگر اس انداز سے پیش کیے ہیں کہ قاری اثر سے بھیگ جاتا ہے۔

زاہدی بنیادی طور پر ایک شاعر ہے۔ اس کے انداز بیان میں ایک رنگینی ہے' ایک دھیما پن ہے' لطافت ہے' جاذبیت ہے۔

لیکن یہ جملہ معترضہ تھا۔

میرا موضوع انور زاہدی کی شخصیت ہے۔ اس کا فن نہیں۔ فن کے بارے میں میں ''جٹکا ڑی'' بات جانتا ہوں' وہ یہ کہ اگر لکھنے والے میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے تو وہ لازماً اس کا اظہار کرے گا۔ جس فارمیٹ میں چاہے اظہار کرے' علامتی ہو یا تجریدی یا روایتی یا کچھ اور۔ ہم اسے پابند نہیں کر سکتے۔

برتن اہم نہیں' یہ اہم ہے کہ برتن میں کیا ہے۔

خالدہ کے الفاظ میں شیر کی طرح دھاڑتے افسانے ہوں یا درخت کی شاخ پر دبکی ہوئی بلی کی طرح ممیاتے افسانے ہوں' کیسے بھی ہوں لیکن دل پر اثر چھوڑ جائیں۔

ایک قاری کی حیثیت سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ

نظر کو ہے عادت تماشا جہاں ہو جیسا ہو جس طرح ہو
کوئی یہ حسن ازل سے کہہ دے کہ جلوہ آرا ہو جس طرح ہو

ڈاکٹر زاہدی کے پاؤں میں چکر ہے۔ لگتا ہے جیسے قدرت کا منشا ہے کہ وہ سدا کامی ہی رہے۔ زندگی جدوجہد میں گزرے' جب وہ

ہاؤس جاب سے فارغ ہوا تو ۱۹۷۱ء کی جنگ چھڑ گئی۔ حب الوطنی کے جوش میں اس نے خود کو فوجی خدمات کے لیے پیش کر دیا۔

والد نے بڑی مشکل سے اسے فوج سے ریلیز کرایا' اس بنا پر کہ وہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پھر جب وہ جنرل ہسپتال میں میڈیکل آفیسر بن گیا تو ایران سے آفر آ گئی۔ چار سال وہ ایران کے صوبہ مازندران میں تعینات رہا۔ واپسی پر اس نے ملتان میں اپنا ذاتی کلینک کھول لیا۔

زاہدی کی خوش اخلاقی اور جذبہ خدمت کی وجہ سے جب کلینک چل نکلا تو اچانک اسے گردے کا آپریشن کرانا پڑا۔ میڈیکل ایڈوائس کے مطابق اسے ملتان چھوڑنا پڑا اور کسی ٹھنڈی جگہ منتقل ہونا پڑا۔

یوں اسلام آباد آ کر از سرِ نو کیریئر شروع کرنا پڑا۔ سروس کے لحاظ سے سینئر ہونے کے باوجود آج بھی اسے جونیئر ڈاکٹر کی طرح صبح و شام کام کرنا پڑتا ہے۔

وہ ایک بڑے کنبے کا کفیل ہے۔ احساس ذمہ داری کی طرح اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔

خانہ بدوش قسم کی زندگی گزارنے کے باوجود زاہدی میں تخلیق کا Urge جوں کا توں قائم رہا۔ لکھنے کا شغل بچپن سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ کالج کے جریدے میں اس نے دل کھول کر مشق کی۔ ایران میں شعر و سخن سے متاثر ہو کر اس نے تراجم کو اپنایا۔

۱۹۸۲ء میں یہ منظوم اور منثور ترجمے ''دریچوں میں ہوا'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اپنی نظموں کا مجموعہ ''سنہرے دنوں کی شاعری'' اس نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا جسے صادقین نے مصور کیا۔ ۱۹۷۸ء میں اس نے ہرمن ہسے کی ''وانڈرنگ'' کا ترجمہ کیا ''بارشوں کا موسم'' اور ۱۹۹۱ء میں اس نے اپنے افسانوں ''عذاب شہر پناہ'' شائع کیا۔

ڈاکٹر زاہدی کی شخصیت کا حیران کن پہلو یہ ہے کہ Extrovert کا سورج بڑی سفاکی سے چمک رہا ہے موسم سوکھا کاٹھ ہے لیکن ہوا تخلیق کی دھکی چھپی نمی سے بھری ہوئی ہے۔

♦♦♦

نوباڈی

(ڈاکٹر رشید نثار)

چند ایک سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کی ایک محفل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کچھ چہرے جانے پہچانے تھے کچھ ان جانے۔ لیکن ان جانے ہونے کے باوجود مانوس تھے۔ چونکہ دانشوری کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔
دانشوری کی چھاپ دانشور پر نہیں لگتی۔ اس فرد پر لگ جاتی ہے جو سمجھتا ہے کہ میں دانشور ہوں۔ میری بیشتر زندگی ایسے دانشوروں میں گزری ہے۔

اس روز حلقہ کی محفل میں دفعتاً میرے سامنے ایک چہرہ آیا اور گزر گیا۔ میں چونکا۔ ارے یہ کیا چیز ہے؟
مجھے ایسا لگا جیسے شدھ راگ میں بے برجت (ممنوعہ) سر لگا ہو۔ جیسے موروں کے جھرمٹ میں فاختہ آ گئی ہو۔
اس چہرے سے مٹھاس کی پھوار اڑ رہی تھی۔ اس کے وجود سے ''میں تو کچھ بھی نہیں'' کی زیر لبی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔
میرا جی چاہا کہ اٹھ کر اسے سلام کروں۔
پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے کہ کچھ افراد کو دیکھ کر' کسی وجہ کے بغیر' دلیل کے بغیر' مصلحت کے بغیر جی چاہتا ہے کہ انہیں جھک کر سلام کروں۔

میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ یہ کون شخص تھا؟

حلقے کا ایک کارکن ہے۔ اس نے جواب دیا۔

اس کے علاوہ؟ میں نے پوچھا۔

اس کے علاوہ------- He is nobody

سیانے کہتے ہیں' ہر فرد کے وجود سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ جن کے رنگ اس فرد کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں' شخصیت کی اس دھنک کو ''اورا'' کہتے ہیں جسے دیکھنے یا محسوس کرنے کے لیے ایک خاص حس درکار ہوتی ہے۔ میں اس حس سے محروم ہوں۔ لیکن اس

نوباڈی کا ''اورا'' اس قدر پر اثر تھا کہ مجھے بھگو کر رکھ دیا۔

اس کے بعد کئی ایک دن اس کا خیال مجھے ''ہانٹ'' کرتا رہا جی چاہتا کہ پھر اس سے ملوں۔ اسے سلام کروں۔

میں نے ڈاکٹر شمشاد سے پوچھا۔ ڈاکٹر شمشاد ہارون امریکہ سے پاراسائیکالوجی میں خصوصی ٹریننگ حاصل کر کے آئی تھیں۔

میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر' اورا'' کو دیکھنے کی حس کیسے حاصل کی جاتی ہے؟''

وہ ہنسی' کہنے لگی ''مفتی جی! اب تو ایسی مشینیں ایجاد ہو چکی ہیں کہ جو' اورا'' کو ریکارڈ کر لیتی ہیں اور معالج ''اورا'' کو دیکھ کر مرض کی تشخیص کرتا ہے میں خود کراچی میں ایک ایسا معمل کھولنے والی ہوں۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے ٹریننگ کہاں سے لی ہے؟''

بولی ''امریکہ میں ایک اولیاء اللہ کا شہر ہے۔''

''امریکہ میں اولیاء اللہ کا شہر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں امریکہ میں۔ وہاں ۸۰ فیصد لوگ بھرپور دنیاوی زندگی بسر کرتے ہیں اور بیس فیصد تحقیق کے کام میں خود کو بھولے بیٹھے ہیں۔ لباس کا ہوش نہیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں۔ نام ونمود کی چاہ نہیں۔ الٹا خود کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ بس سر پر ایک دھن سوار ہے کہ قدرت کے بھید کو جانیں۔ سمجھیں! مفتی جی ولی اللہ اور کسے کہتے ہیں۔ ولی اللہ وہی ہے نا جو اللہ کی کائنات کو سمجھنے میں خود کو بھلائے بیٹھا ہو۔

اس کے بعد دو ایک بار وہ مجھے ادبی محفلوں میں نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک عام آدمی ہے۔ خود کو دوسروں سے کم تر سمجھتا ہے۔ ایک کامی۔ حکم ماننے والا۔ خدمت پر کمر بستہ۔ مٹی کا ایک میلا کچیلا دیا جو مدھم لو سے جل رہا ہے۔

میں نے کسی سے پوچھا' یہ کون ہے کہاں کا ہے؟

تم اسے نہیں جانتے کیا؟ اس نے جواب دیا۔ یہ رشید نثار ہے۔ پوٹھوہار کا اعوان ہے۔

''نہیں' یہ پوٹھوہار کا نہیں ہو سکتا۔ پوٹھوہار کا تو جنگجو ہوتا ہے' خوددار ہوتا ہے۔ ذات کے مان سے بھرا ہوتا ہے۔ نک چڑھا ہوتا ہے' مچھ مروڑ ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہ ہو تو بھی خود کو سم باڈی سمجھتا ہے۔

پھر ایک ادبی محفل میں میں نے دیکھا کہ وہ روسٹرم پر کھڑا مقالہ پڑھ رہا ہے۔

میں حیران ہوا۔ ارے یہ کون بول رہا ہے۔ اتنی پر شکوہ نثر اتنے فلسفیانہ خیالات' تخیل نفسی' تحقیق تنقید نہیں۔ یہ وہ رشید نثار نہیں ہو

سکتا جس پر ''میں تو کچھ بھی نہیں'' کی چھاپ لگی ہے' جو مٹی کے دیے کی مدھم لو سے جلتا ہے۔

میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا' یہ رشید نثار کتنا پڑھا لکھا ہے؟

وہ بولا۔ ''بی اے آنرز ہے۔ اردو انگریزی اور اسلامیات میں ایم اے ہے' شاعر ہے۔ صاحب طرز مقالہ نگار ہے۔

دکھتا تو میٹرک فیل ہے۔ میں نے کہا۔

''ہاں'' وہ ہنسا۔ ایسے ہی دکھتا ہے۔ صرف دکھتا ہی نہیں ساری زندگی میٹرک فیل کی حیثیت سے گزاری ہے۔ ڈگریوں کا فائدہ حاصل نہیں کیا۔

صاحبو میں نے زندگی میں تین ''نوباڈی'' دیکھے ہیں۔ ایک قدرت اللہ شہاب تھا لیکن وہ عام نوباڈی نہیں تھا' پراسرار نوباڈی تھا۔ وہ اونچے عہدے پر فائز تھا' دانشور تھا' بیوروکریٹ تھا۔ پتہ نہیں اس کے اورا میں عجز کی ٹوٹ اتنی پراثر کیوں تھی۔ جب وہ تھری سوٹ پہن کر ہارڈ کالر میں شوخ رنگ کی ٹائی لگا کر بٹن ہول میں سفید پھول سجا کر صدر مملکت کے جلسے میں خصوصی دروازے سے داخل ہوتا تو دروازے پر کھڑا انسپکٹر اسے روک لیتا۔ صاحب آپ ادھر عام دروازے سے داخل ہوں' یہ خصوصی دروازہ ہے۔

جب وہ جلسہ گاہ میں ریزرو نشستوں پر بیٹھتا تو انٹیلی جنس کا کوئی افسر اسے اٹھا دیتا۔ جناب یہ نشستیں اہلکاروں کے لیے ہیں۔ آپ ادھر جنرل پبلک میں جا کر بیٹھیں۔

ایک دن میں نے قدرت سے پوچھا' میں نے کہا۔ یہ کیا اسرار ہے؟ آپ بن ٹھن کر جاتے ہیں' لباس خصوصی ہوتا ہے' انداز خصوصی ہوتا ہے لیکن خصوصی دراوزے پر کھڑا انسپکٹر آپ کو روک لیتا ہے۔ وہ آپ کو عمومی کیوں سمجھتا ہے؟ کیا اس لیے کہ آپ کے ''اورا'' پر عمومی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا ''میں خود حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے حالانکہ میں خصوصی بننے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔''

تیسرا نوباڈی غلام محمد تھا۔

وہ ستار بجایا کرتا تھا حالانکہ ستار ایک طربیہ ساز ہے۔ لیکن غلام محمد کی ستاریوں بجتی تھی۔ جیسے سارنگی ہو وہ بجتی نہیں تھی روتی تھی۔ اس میں دکھ تھا درد تھا التجا تھی۔ وہ منتیں کرتی تھی ترلے لیتی تھی۔

میں اس سے پوچھتا' غلام محمد لوگ نماز پڑھ کر دعا مانگتے ہیں' تو ستار بجاتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟

وہ جواب دیتا میں بھی تو دعا ہی مانگتا ہوں۔ یہ مجھ سے بہتر دعا مانگتی ہے' زور وکر ترلے لیتی ہے' منتیں کرتی ہے' دکھ درد کی کتھا سناتی

ہے۔

میں نے پوچھا' غلام محمد تو نے یہ دکھ کہاں سے پایا؟

بولا" بڑی بھاری قیمت دے کر پایا۔ میں نے سب کچھ دے دیا جو میرے پاس تھا' سب کچھ۔"

"کیا تھا تیرے پاس؟"

میرے پاس آنکھیں تھیں جن میں پھلجڑیاں چلتی تھیں۔ جس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھتا وہ میری ہو جاتی۔ میرے گرد پروانوں کی اک بھیڑ لگی رہتی تھی۔ میری طرف ایک خواہش تھی کہ ستار بجاؤں لیکن وہ بجتی نہ تھی۔

پھر باباجی آ گئے۔ میں نے کہا' باباجی دعا کرو کہ میری ستار بجے۔

بابا مسکرایا' بولا پتر اندر درد نہیں تو ستار کیسے بجے؟

بابا نے میری آنکھوں کو کالے چشموں سے ڈھانپ دیا۔ حکم دیا کہ خبردار آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھنا۔ میں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر میری ستار بجنے لگی۔ ایسی بجی کہ جب دعا مانگتی ہے تو وہ خود نیچے اتر کر میرے روبرو آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

رشید نثار بھی بھرپور نگاہ سے دیکھتا ہے تو لگتا ہے کبھی پھول انگارے جھڑتے تھے۔ اب عدم استعمال سے زنگ آلود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کنہیا کے گرد بھی کچھ بن نہ جاؤں۔ گمان غالب ہے کہ اس نے آنکھیں موند لیں۔ پھر بھی ایک ہندو دیوی نے اسے نثار کا لقب بخش دیا اور وہ عبدالرشید سے رشید نثار بن گیا۔ پتہ نہیں وہ دیوی خود نثار تھی یا چاہتی تھی کہ رشید نثار ہو جائے۔

رشید کی زندگی کا بیشتر المیہ اس کی Jeans کی وجہ سے ہے۔

اس کی Jeans نے اس پر اتنی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ کہ خودمختاری محض ایک تہمت رہ گئی ہے۔

وہ ازلی طور پر ایک کامی ہے۔ خدمتی ہے' خاکسار ہے' عقیدتی ہے' صرف صوفی منش ہی نہیں ساتھ ملامتیہ بھی ہے۔

صاحبو میں تصوف کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ جاننے کی کوشش کی تو کتابوں نے مجھے مزید کنفیوژ کر دیا۔ کتابوں میں یہ عیب ہے کہ وہ راستہ نہیں دکھاتیں بلکہ چوراہے پر لا کر چھوڑ جاتی ہیں۔

میں نے بڑے صوفیوں کے تذکرے پڑھے۔ ان میں عابد تھے' سرکار قبلہ تھے۔ صاحب کشف و کرامات تھے لیکن ان کے اندر کے عظیم انسان کا ذکر نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان سے عقیدت پیدا کر سکتے ہیں ان سے محبت کے جذبے سے محروم رہتے ہیں۔

میری دانست میں صوفی ایک رویہ ہے اک رخ ہے وہ یہ کہ جو ہے۔ جیسا کیسا بھی ہے' سبحان اللہ کہ ہے جو نہیں ہے' خوب ہے کہ

نہیں ہے۔اتنی سی بات انسان کو کیا مقام عطا کر دیتی ہے۔

صوفی منش لوگ صوفیا کی طرح عظمت کے مینار نہیں بنتے۔وہ انسانوں سے الگ نہیں ہوتے بلکہ ان میں گھلے ملے رہتے ہیں۔

رشید نثار کے یہ تمام اوصاف توارثی تھے۔خدمت اور عقیدت کی بیماری خاندان کی دین تھی۔

رشید کا دادا میاں فضل کلیان آواں کے بزرگ کا پگڑی بدل بھائی تھا۔باپ میاں فضل کے مرید سائیں سنگھوری والے کی چوکٹ کا چلہ کش تھا۔بچپن ہی میں رشید کو بری امام کے حوالے کر دیا گیا تھا۔اس پر عائد تھا کہ خدمتی کامی بن کر زندگی گزارے۔

اسی وجہ سے رشید نثار نے اتنی ساری ڈگریوں کے ہوتے ہوئے اپنے کیرئیر کا آغاز اخبار نویسی سے کیا۔

پھر اسے قائداعظم سے عقیدت ہوگئی۔انہوں نے حکم دیا کہ نیشنلسٹ اخبار چھوڑ کر مسلم لیگی اخبار میں کام کرو۔دیر تک مسلم لیگ کا ورکر بنا رہا۔

رشید ایک انوکھا سیاسی ورکر تھا۔مقصد کچھ کرنا تھا۔کچھ بننا نہیں تھا۔اس لیے عمر بھر سیاسی کارکن رہنے کے باوجود کچھ بن نہ سکا۔

پھر اسے خیال آیا کہ معالجی خدمت سیاسی خدمت سے بہتر ہے۔بچپن ہی میں وہ محلے کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے حفظان صحت کا درس دیا کرتا تھا۔بچوں سے ورزش کرتا۔کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تو دوادارو کی تمام تر ذمہ داری رشید پر ہوتی تھی۔بہتر خدمت کے جذبے کی وجہ سے وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل ہوگیا۔

ان دنوں خاکساروں کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔رشید نے کالج میں خاکسار سپرٹ کو اس شدت سے پھیلایا کہ حضرت حیات کے حکم سے کالج سے نکال دیا گیا اور کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔

پھر وہ جی ایچ کیو میں کلرک بن گیا۔کچھ دیر پنڈی رہا پھر کوئٹہ تبدیل کر دیا گیا۔وہاں کئی ایک سال روزنامہ ''اتحاد'' ایڈٹ کرتا رہا۔

کوئٹہ میں محشر رسول نگری سے عقیدت لگا بیٹھا۔تیرہ سال اس کے قدموں میں بیٹھا رہا۔

محشر پہلی مرتبہ مجھ سے ملا تو کہنے لگا' مجھ سے ملو۔میں نے پوچھا'' تم کون ہو؟''

کہنے لگا'' میں اصل ہوں جس کی تم نقل ہو۔میرا نام محشر رسول نگری ہے۔''

میں نے کہا۔'' جا بھائی جا' تو بزرگ ہے۔میں نہ تو بزرگ ہوں نہ مجھے خود بزرگ بننے یا کسی بزرگ سے ملنے کی طلب ہے نہ میرا کسی بزرگ سے تعلق ہے۔''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ بولا" آپ سے کس نے کہا کہ میں بزرگ ہوں یا میرا بزرگوں سے کوئی تعلق ہے؟"

"سبھی کہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اور آپ مان لیتے ہیں۔ مفتی آپ بڑے احمق ہیں۔"

"وہ تو میں ہوں ہی۔" میں نے کہا۔

"میں بھی ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "دیکھو" وہ بولا۔ "تم بھی ایک انسان کے مارے ہوئے ہو میں بھی ایک انسان کا مارا ہوا ہوں۔ جس کا میں مارا ہوا ہوں وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا۔ مریض ڈاکٹروں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں' وہ مریضوں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اس کا مسلک خدمت تھا بے غرض خدمت۔

تم نے اپنی کتاب "لبیک" میں لکھا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کاش کہ میں کسی ندی کو راہبر بناتا۔ مجھے یہ تو پتہ چلتا کہ وہ کدھر سے آتی ہے کدھر کو جاتی ہے۔ اس کی منزل کیا ہے۔ لیکن میں نے سمندر کو راہ بنالیا نہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کدھر سے آتا ہے نہ پتہ چلتا ہے کہ کدھر کو جاتا ہے۔ وسعت ہی وسعت بے کراں وسعت۔ تم نے لکھا تھا نا وہ بولا۔

ہاں لکھا تھا۔ میں نے کہا۔

وہ بولا بس یہی غلطی میں نے کی۔ اب میں بے کراں وسعت میں آوارہ ہوں۔

پتہ نہیں رشید نثار نے محشر میں کیا دیکھا۔ تیرہ سال اس کی جوتیوں میں پڑا رہا۔

پھر اسے پنڈی جی ایچ کیو میں تبدیل کر دیا گیا۔

جی ایچ کیو والے رول قانون کے دیوانے ہوتے ہیں۔ وہ بیچارے سخت پریشان تھے کہ یہ رشید نثار کیا چیز ہے جو اتنی ڈگریاں ہوتے ہوئے بھی کلرکی کر رہا ہے۔ انہوں نے سوچ سوچ کر اسے نیشنل ڈیفنس اکادمی میں بھیج دیا۔

رشید نثار اپنی ڈیوٹی تو سرانجام دیتا رہا لیکن ساتھ ہی خدمتی کامی جذبے کی تسکین کے لیے سیاسی ورکر کا کام بھی شدومد سے کرتا رہا۔

جی ایچ کیو نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھو ایسے نہیں چلے گا' ہم فوجی ہیں۔ فوجی سیاسی نہیں ہوتے۔ تم یا تو نوکری کرو یا سیاسی کام کرو۔ یہ دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔ سوچ لو کہ کیا کرنا چاہتے ہو۔

رشید نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔

پھر وہ دیہاڑی دار بن گیا۔ آج تک دیہاڑی دار ہے۔ جو کام ملا کر لیا۔ جتنے پیسے ملے، بیوی کی جھولی میں ڈال دیئے۔

حیرت کی بات ہے کہ بیوی اس کی ساتھی ہے۔

عام طور پر ایسے شخص کو ایسی بیوی عطا ہوتی ہے جو راستے کی رکاوٹ ہو۔ اللہ کے بھیدوں کو کس نے جانا ہے۔ مل جاتا ہے تو پیٹ بھر کر کھا لیتے ہیں۔ نہیں ملتا تو گزارہ کر لیتے ہیں جیسے کیسے بھی ممکن ہو، جو ہے خوب ہے۔

رشید نثار علامہ مشرقی کا پرستار ہے۔ کہتا ہے علامہ ایک مکمل انسان ہے۔ سائنس دان ہے، عالم ہے فلسفی ہے۔ مسلمان ہے، مجاہد ہے۔ سوشل ورکر ہے اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم آرگنائزر ہے۔ جس نے خاکسار تحریک کو چلایا یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کی روئے زمین پر مثال نہیں ملتی۔ رشید نثار نے علامہ پر ایک کتاب تصنیف کی ہے "المشرق" ایک سال سے وہ کتاب تشنہ طباعت پڑی ہے، خود چھپوانے کی توفیق نہیں۔ پبلشرز کی تلخ باتیں سنتا ہے پی جاتا ہے۔

◆◆◆

تھری ناٹ تھری

(افتخار عارف)

افتخار احمد کی شخصیت آج کل راولپنڈی اسلام آباد کے ادبی حلقوں پر یوں چھائی ہوئی ہے جیسے برکھارت بادل پر۔

وہ ہر ادبی محفل میں موجود ہوتا ہے کہیں مہمان خصوصی کہیں سامع ہر مشاعرے میں اپنا کلام پیش کر رہا ہوتا ہے۔ ہر نجی محفل میں حاضرین کی فرمائشوں سے گھرا ہوتا ہے۔

اس کی شخصیت میں دو پہلو نمایاں ہیں برتاؤ میں روایتی کلچر مٹھاس جس سے چھینٹے اڑتے رہتے ہیں اور محفل کو بھگو دیتے ہیں اور کلام کی انفرادیت' اس کی شخصیت روایات اور انفرادیت کا حیران کن سنگم ہے۔ حیران کن لیکن خوشگوار۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے لیکن ایسے ہوتا ہے کہ وہی اوصاف جو جذبہ تحسین پیدا کرتے ہیں کانٹے میں بوتے ہیں۔ قدرت کا اصول ہے کہ قابل تحسین افراد لازماً کرتے ہیں۔ افتخار عارف بھی اسی اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ بیک وقت تحسین بھی کرتا ہے اور ہاسٹیلیٹی بھی۔ تحسین بھرپور' ہاسٹیلیٹی' کم کم' دبی دبی' مدہم۔ لیکن چاہے کتنی ہی مدہم ہو ہاسٹیلیٹی ہاسٹیلیٹی ہوتی ہے۔ آج کل وہ اکادمی ادبیات کا ایک اعلیٰ اہلکار ہے۔ کرسی پر بیٹھا ہو تو لگتا ہے جیسے بوریا نشین ہو۔ کیوں نہیں کہ یہ بھید آج تک نہیں کھلا۔ اس کے انداز یا عام برتاؤ میں بظاہر عہدے کا تناؤ موجود ہے دانش وریں کی ٹیس نمایاں ہے۔ اس کے انداز میں تخلیقی صلاحیتوں کی چھکن نمایاں نظر آتی ہے۔ پھر بھی ازلی بوریا بستر نشیں ہے۔ جب وہ نیا نیا پاکستان آیا تو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے کسوٹی کی بناوٹ چلا کر ہمیں مسکور کر دیا تھا۔ اس کے ذہن اور جسم میں بلا کا ربط تھا دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تخلیقی شاہراہ پر گامزن تھے۔ پھر پتا نہیں لندن میں کیا ہوا۔ جسم اور ذہن میں کیوں ان بن ہو گئی اب دیکھو تو لگتا ہے کہ ذہن اور حس تھری ہیں لیکن جسم جلا ہوا کا توس ہے۔

ہمارے آج کے دانش وروں میں ذہن اور جسم کی بے ربطی کے امام صاحب جناب ضمیر جعفری ہیں۔ دیکھو تو لگتا ہے کہ ننکاری بازار کے آڑھتی ہیں۔ ویسے مزاحیہ شاعری کے گرو گھنٹال ہیں۔ بے تاج بادشاہ' اس ضمن میں کچھ اور دانشوروں کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے مثلاً منشا یاد ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔ معنی چاہتا ہوں میں منشا یاد کا ذکر نہیں کروں گا میں اس سے تعلقات خراب کرنا

افورڈ نہیں کرسکتا۔ ضمیر کا ذکر اس لئے کر دیا کہ وہ Incorrigible Optimist ہے' ہر بات پر کھیں کھیں ہنس دیتا ہے۔

جسم اور ذہن کی بے ربطی کی بات کرو تو فیض سامنے آ کھڑا ہوتا ہے ذہن اور حسیات کتنی بلندی پر پرواز کر رہے تھے جسم پھسڈی مات کت زمین پت گل محمد بنا بیٹھا رہتا تھا صرف آنکھ تھی جو چھلکی چھلکی رہتی تھی۔ تو بہ کیا آنکھ تھی جب میں نے پہلی مرتبہ اسے عنفوان شباب میں دیکھا تھا تو اس کی آنکھ کی چھلکن نے مجھے ہولا جھلا دیا۔ میں نے سوچا تھا یا اللہ یہ کس کس کو جھلائے گی کس کس پر ظلم ڈھائے گی۔ جب میں نے پہلی مرتبہ بھرپور جوانی میں احمد ندیم قاسمی کو دیکھا لیکن نہیں۔ پھر میں معافی چاہتا ہوں احمد ندیم بڑوں میں سے ہے اور مجھے حکم ہے کہ مفتی چھوٹا بن کر جیو۔ سکھی رہو گے۔ بڑوں کے پھٹوں میں ٹانگ نہ اڑانا۔

آمد برسر موضوع ہے۔ پتہ نہیں لندن میں وہ کیا حادثہ ہوا کہ افتخار عارف کے جسم اور ذہن کا رابطہ قائم نہ رہا' حسیات اور شاہراہ پر رواں دواں رہے لیکن جسم کسی پگ ڈنڈی پر چڑھ گیا۔

اب یہ عالم ہے کہ خاموش بیٹھا ہو تو ''ٹھس'' نظر آتا ہے بات کرتا ہے تو مخمل لگ جاتی ہے۔ کلام سناتا ہے تو پھلجھڑیاں چلتی ہیں۔

یہ تو بات کی بات تھی ویسے افتخار عارف کے اندر ہر وقت چھلکن کی پھوار اڑتی رہتی ہے۔ صاحبو مجھے اجازت دو کہ میں چھلکن کی وضاحت کروں۔ میرے نقاد مجھے ڈانٹتے ہیں کہتے ہیں' مفتی اپنے ہر خاکے پر یوں سوار رہتا ہے جیسے صاحب خاکہ ویسپا کا سکوٹر ہو۔ وہ سچ کہتے ہیں معذرت خواہ ہوں۔ اس لئے کہ میں خدا کی بے لاگ لگاؤ آنکھ سے گرد و پیش کو دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ میں خدا نہیں بندہ ہوں۔ میں صرف وہ کچھ دیکھتا ہوں جو لکھتا ہوں اور جو لکھتا ہوں جو مجھے دکھتا ہے۔ میں نے کبھی حتمی سچائی کو پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ ''اپنا سچ'' پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے سچ میں کبھی ڈنڈی نہیں ماری۔

ہمرے بیشتر نقاد اس چھوٹی سی حقیقت کا شعور نہیں رکھتے یا اسے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ عام نارمل فرد کی شخصیت مٹی کے مترادف ہوتی ہے لیکن تخلیقی فرد نارمل فرد میں قیام ہوتا ہے' استحکام ہوتا ہے۔ تخلیق کار میں مسلسل حرکت' بے چینی اضطراب' جس کی وجہ سے چھلکن عمل میں آتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ میرے بیشتر نقاد صرف اردو ادب کے مطالعہ کے زور پر رسمی خاکوں کا معیار سمجھ کر تنقید کرتے ہیں۔

وہ ''ہیومن پرسنیلٹی'' کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یارو اگر تم مجھے تھوڑے سے تفاخر کی اجازت دو تو میں عرض کروں کہ میں اردو ادب کے بندھے ٹکے اصولوں کا پابند نہیں ہوں۔ میں تخلیق کار ہوں۔ میں اصولوں پر چلتا نہیں' اصول بناتا ہوں۔

اس بے ضابطگی کا سزاوار صرف میں ہی نہیں ہوں آپ بھی ہیں۔ ہر تخلیق کار ہے۔ ہر تخلیق کار چھلکن میں ڈب جھلکے کھاتا ہے۔ ہر

ڈب جھلکے کھانے والا کسی نا کسی تنکے کا سہارا لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ تخلیق چھلکن ''پوزیٹونیگٹو'' کے مترادف ہے۔ شعلہ پیدا کرنے کے لئے وہ کسی ''نیگٹو'' رو کی محتاج ہوتی ہے۔ کوئی ٹھرا بوتل کا سہارا لینے پر مجبور ہوتا ہے' کوئی نہ بے دی بند بوتل کا'' کوئی جٹا دھاری بن جاتا ہے'' کوئی ہاتھوں میں گولے تھام لیتا ہے' کوئی تفاخر کی پھونک بھر کر غبارہ بن جاتا ہے۔ کوئی ڈگڈگی بجانے پر مجبور ہے کوئی ڈھنڈورچی کی طرح بھیڑ لگانے پر۔

صاحبو یہ ہماری کج فہمی ہے کہ ہم ان سہاروں کو عیب سمجھتے ہیں' کمزوریاں گنتے ہیں۔ میں بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔

پھر ایک دن دلی کے اشوکا ہوٹل میں مجھ سے فاش غلطی سرزد ہوگئی۔ اس کا انٹرویو لینے کی لئے میں نے اسے چھیڑ دیا بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا۔ انتقاماً افتخار عارف نے اپنی آپ بیتی چھیڑ دی۔

ایک دم منظر بدل گیا۔ پروا چلنے لگی۔ گھوور گھٹائیں چھا گئیں۔ افتخاریوں موسلا دھار برسا کہ نہ افتخار عارف رہا نہ ممتاز مفتی نہ اشوکا ہوٹل نہ دلی' سب پانی ہی پانی ہوگیا سب ڈوب گئے۔

تب میں نے جانا کہ قدرت کنول کا پھول اگانے کے لئے پہلے جھیل بناتی ہے' چھل چھل چھلماتی جھیل۔ گلاب کا پھول کھلانے کے لئے پہلے کانٹے لگاتی ہے۔ صاحبو یہ کہانی صرف افتخار عارف کی ہی نہیں۔ آپ کی بھی ہے۔ ہر تخلیق کی ہے۔

معاف کیجئے آج میں کہ دینے کے موڈ میں ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے آپ کو اس عظیم ترین تخلیق کار کی کہانی سناؤں جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جو قادر مطلق ہے۔

یہ کہانی مجھے یورپ کی کسی کہانی کار خاتون نے سنائی تھی۔ کہنے لگی لوگوں کا اک ہجوم لگا تھا۔ ہر کسی کے ہونٹوں پر شکایت تھی۔ یا اللہ یہ دنیا تو نے کیسی بنائی ہے۔ ہر کوئی دکھی ہے' کوئی بھی خوش نہیں ہے امیر بھی دکھی ہے' غریب بھی دکھی ہے' جسے اقتدار حاصل ہے وہ بھی کانٹوں کی سیج پر لیٹا ہوا ہے' محکوم کو کوئی گنتی کے شمار میں نہیں لاتا' مظلوم کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔

ہجوم میں سے ایک شخص بولا چلو جا کر اسے پوچھیں کہ یہ کیسی دنیا بنائی ہے تو نے۔ سب نے کہا، ہاں چلو تو اسے پوچھیں۔

وہ چل پڑے۔ چلتے رہے، چلتے رہے، آخر پہنچ گئے۔

دیکھا کہ ایک ضعیف کامی بیٹھا گڈے گڈیاں بنانے میں بری طرح مصروف ہے۔ سامنے اوزار پڑے ہیں' منہ پر جھریاں لٹک رہی ہیں' ہاتھ مشقت سے کھردرے ہیں' پسینے میں شرابور ہے۔

وہ ایسے دیکھ کر حیران ہوئے' انہیں چپ لگ گئی۔

پھر ایک بولا' یا اللہ یہ تو نے کیسی دنیا بنائی ہے۔ دوسرے نے کہا۔ اس کی تو کوئی کل سیدھی نہیں۔ تیسرا بولا یہاں تو سبھی دکھی ہیں۔ چوتھے نے کہا۔ واللہ...... کیا ایسی دنیا بنایا کرتے ہیں۔

بوڑھے نے سر اٹھایا۔ پسینہ پونچھا۔ مدہم آواز میں بولا۔ کیا تمہیں پسند نہیں آئی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا گال پر رک گیا۔ کہنے لگا۔ میں تو بڑی محنت کرتا ہوں۔ بڑی جان مارتا ہوں۔

نقاد مونچھ پے موڑ کر کہتے ہیں' یہ تو نے کیا جھک مارا ہے۔ تخلیق کار بڑی بے بسی سے مدہم سرگوشی میں کہتا ہے۔ اچھا۔۔۔۔ میں تو بڑی محنت کرتا ہوں جان مارتا ہوں۔

صاحبو یہ ہر مخلص تخلیق کار کی کہانی ہے۔ آپ کی بھی میری بھی۔

لیکن بظاہر افتخار عارف تو بڑا خوش نصیب ہے۔ وہ تو چاروں طرف رحسین سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن اس کے اندر کے تخلیق کار کو دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھو جب وہ اپنا کلام سنا رہا ہو۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں شرارے اڑتے ہیں یا جب وہ اپنی گرل فرینڈ کی جانب دیکھ رہا ہو۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں بھور سے ہوتا ہے۔

افتخار عارف میں نے پہلی مرتبہ ٹیلی ویژن کے پروگرام پر دیکھا تھا۔ تینوں کسوٹے میرے سامنے کھڑے تھے۔ عبیدہ قریشی اور عارف تینوں کے دامن معلومات ذہانت اور یادداشت بھرے ہوئے تھے۔

انہوں نے چند سوالات میں میرا پھلکا اڑا دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اتفاق سے افتخار کو تنہائی میں دیکھا۔ بات پلے نہ پڑی۔ اس میں روانی بھی تھی احتیاط بھی' روشنی بھی الجھن بھی تڑپ بھی تھی لیکن پتہ نہیں چلتا تھا کہ آگے بڑھنے کی ہے یا سمٹ کر پیچھے ہٹنے کی۔ غالباً دونوں تھیں۔ صاحبو بیک وقت دونوں ہوں تو تماشا بن جاتا ہے۔

پھر کچھ دیر کے بعد افتخار عارف کے شعر گونجنے لگے۔ فضا بھر گئی ان شعروں میں رنگینی تھی' آوارگی تھی' دعوت تھی' وحشت تھی اور سب سے بھر کر افتخار عارف تھا۔ اتنی انفرادیت تھی کہ ایک ایک مصرعے پر مہر لگی تھی' ایک ایک مصرح بول رہا تھا۔ سننے میں آیا کہ کراچی کی لڑکیاں طواف کر رہی ہیں۔ افتخار اندر بنا بیٹھا ہے۔ پر وحشتوں کی ساتھیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔

افتخار عارف میری دانست میں' پہلا تخلیق کار ہے جس نے برملا الفاظ میں کہہ دیا کہ فنکار وحشتوں کا تابع ہوتا ہے' پہلا شاعر جس نے وحشیوں کے ساتھ کی آرزو کا برملا اظہار کر دیا۔ بھید کھل گیا۔

شہرت کی چاندنی میں افتخار خوب نہایا۔ اندر میں وحشی جاگیں۔ "ہو کیرز" "ہٹاؤ چھوڑو" رویے ظاہر ہوئے محبوبیت نے شکارے

کے مکڑ جالے تنتے رہے۔

افتخار عارف کی نچلی منزل کی کیفیت کا احساس مجھے ۱۹۸۷ء میں ہوا ان دنوں بیٹھے بیٹھائے مجھے ایک خط موصول ہوا۔ جس میں اردو مرکز کی جانب سے مجھے لندن آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

ہاتھ پاؤں تو پھولنے ہی تھے۔ جناب والا میں اس دور کا فرد ہوں جب لندن کو ولایت کہتے تھے سمندر کا کالا پانی۔ پھولے ہاتھ پاؤں سمیت لندن پہنچا۔ لندن میں گھومنے پھرنے سے مجھے دلچسپی ہو سکتی تھی۔

الطاف گوہر نے اپنے پبلک ریلیشین افسر مسٹر جان کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ جاؤ مفتی کو لندن کہ جگہیں دکھلاؤ۔ ایک دن مسٹر جان کا دل رکھنے کے لئے میں ویسٹ منسٹر الیے دیکھنے چلا گیا۔ وہاں اتنے مقتول اور مردے دیکھے کہ تین دن سر درد رہا۔ پھر توبہ کرلی باقی دن ارعو مرکز کے ایک کونے میں لگ کر بیٹھا رہا۔

وہ اردو مرکز نہیں تھا وہ تو افتخار عارف نے لندن کے عین بیچ میں ایک منی برصغیر بنا رکھا تھا۔

لوگ آتے تھے بیٹھتے تھے حال احوال پوچھتے تھے سناتے تھے۔ قصے چلتے کہانیاں چلتیں شعر بازی ہوتی جائے چلتی۔ پان مصالحہ چلتا۔ قصیدے ' شکوے ' شکایتیں لطیفے قہقہے ' لگتا تھا جیسے لندن نہیں کراچی کا کوئی چائے خانہ ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ افتخار عارف اکیلا بیٹھا ہوتا اور وہ بھول جاتا کہ دردکمرے کے اس کونے میں ایک مہمان بھی دیوار سے چپکا بیٹھا ہے سیانے کہتے ہیں کسی شخص کی اصلیت کو دیکھنا ہوتو اسے اس وقت دیکھو جب وہ اکیلا اور فارغ بیٹھا ہو۔ اس کے اندر کی طوایف معدوم ہوگئی ہو اور اسے یقین ہو کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا۔

میں نے دیکھا 'اداسی اکتاہٹ بے چینی فکر دکھ کی بھیگ۔

یا اللہ اس خوش باش بے فکرے رنگیلے شعار میں اتنا دکھ بھرا اضطراب کیوں ہے۔

اس روز مجھے پتہ چلا کہ یہ کنول آنسوؤں کی جھیل میں پیدا ہوا ہے۔

صاحبو جان لو کہ قدرت ایک تخلیق کار پیدا کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرتی ہے۔

لکھنو کے ایک متمدن و مہذب جانے پہچانے کھاتے پیتے گھرانے میں ایک بچہ پرورش پا رہا تھا۔ اسے کوئی پوچھتا نہ تھا کہ تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو کیا کر رہے ہو۔ سبھی جانتے تھے کہ یہ اسی گھر کا چشم چراغ ہے لیکن گھر والوں کو احساس نہ تھا۔

افتخار خود حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ میں اسی گھر کا بیٹا ہوں لیکن کوئی نہیں مانتا وہ بھیڑ میں اکیلا

تھا۔تن تنہا۔

صاحبو یہ تماشا کثرت ازدواج کا نتیجہ تھا۔افتخار ''کھیلو بچے'' تھا۔

اس وارث بچے پر نانا کو ترس آ گیا۔نانا بھی وہ جو سگا نہیں بلکہ سوتیلا تھا۔دوستو قدرت کے انتظامات کا بھی جواب نہیں۔

افتخار کا کہنا ہے کہ بھری دنیا میں اسے صرف ایک فرد نے پیار دیا بھرپور پیار اور وہ اس کا سوتیلا نانا تھا۔پیار کا اہتمام تو ہو گیا لیکن ایسے کہ زندگی کی دوسری آسائشوں کے دروازے جوں کے توں بند رہے۔تشنگی قائم رہی۔

نانا اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ پیٹ بھرنے کے لئے کچھ بچے نہ بچے لالٹین میں تیل ضرور ڈالا جائے تاکہ افتخار کی پڑھائی کا کوئی حرج نہ ہو۔لالٹین کا تیل ختم ہو جاتا تو وہ مانگنے کی کتاب اٹھا کر گلی میں کمیٹی کی لالٹین تلے جا بیٹھتا۔مدرسے کا کام ختم ہو جاتا تو وہ چوری چھپے ایک آنہ لائبریری کی کتاب کھول کر بیٹھ جاتا۔

دھندلی روشنی مین کمیٹی کی اندھی لالٹینوں تلے پڑھے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دائیں آنکھ کی روشنی مدھم پڑ گئی۔مدھم پڑتی گئی۔پھر ایک روز حساب کے ماسٹر بدرالدین نے کسی بات پر ایسے اکھڑے ہاتھ سے طمانچہ مارا' انگلی آنکھ میں اتر گئی۔

ڈاکٹر نے کہا آپریشن ہو گا پتہ نہیں آنکھ بچے گی یا نہیں۔آنکھ بچ گئی تو ایک چشمہ چڑھ گیا۔بدقسمتی سے فریم گر ا ٹوٹ گیا۔نیا خریدنے کی استطاعت نہ تھی' نانا نے اپنا فریم دے دیا۔جیسے کیسے گول فریم میں چوکور شیشے ٹھونک دیئے گئے۔

مطالعہ کا جنون آسیب بن کر چمٹا ہوا تھا بینائی کی کسے پرواہ تھی۔شعر کا ایسا خبط لگا تھا کہ ہزاروں از بریاد تھے۔بیت بازی کے میچ ہوتے تھے افتخار فاتح بن کر پنڈال سے نکلتا تھا۔دوسروں کے شعروں سے ذہن اٹا پڑا تھا' ابھی اپنے اندر کا شعر نہیں پھوٹا تھا۔

ادیبوں اور عالموں کے لئے دل میں اندھا احترام تھا' اب بھی ہے۔یہ لاعلاج بیماری ہے' ایک بار لگ جائے تو جاتی نہیں۔لکھنو میں نیاز' جوش' مجاز' احتشام' سجاد' حسینی' ملا' ماجد دریابادی' علی نقی پتہ نہیں کن کن کے حضور زانوئے ادب تہیہ کیا پھر ایک معجزہ رونما ہوا۔

لکھنو کا ایک لاوارث مفلس ٹوٹا ہوا بچہ' وہ بچہ جس میں چشمہ خریدنے کی طاقت نہ تھی کتاب خریدنے کی استطاعت نہ تھی' اس بچے کو لکھنو یونیورسٹی نے بڑے عزاز کے ساتھ سوشیالوجی میں ایم اے کی ڈگری عطا کر دی۔

صاحبو قدرت بڑی تماش بین ہے' ایسے تماشے کرتی رہتی ہے۔بھارت میں ایک مسلمان نوجوان ایم اے کی ڈگری کو فریم کر کے اپنی گردن میں لٹکا کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

بھارتی حکومت اپنی گزشتہ صدیوں کی پرانی ہزیمتوں کا انتقام لینے سے فارغ ہو تو اقلیتوں کی سلامتی کی طرف توجہ کرے۔فیصلہ

ہوا کہ افتخار کو جیسے کیسے پاکستان بھیج دیا جائے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے' لیکن ایسا ہوتا ہے کہ مائیں زندگی بھر سختیاں جھیلنے کے باوجود اپنے چاؤ پورے کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ماں نے پاکستان بھیجنے سے پہلے اپنے چناؤ کی لڑکی کو افتخار کی دم سے باندھ دیا۔ پاکستان میں شفیع عقیل اور عطر نے انہیں تسلی دی۔ سلیم احمد نے تربیت کی اور اس درویش نے بھرپور سہارا دیا جسے عبیداللہ بیگ کہتے ہیں' جو ٹیلی ویژن کے ویرانے میں ایک واحد سایہ دار جھاڑی ہے۔ پتہ نہیں موروں کی اس نمائش گاہ میں ایک کوا کس امید پر بیٹھا ہے۔

صاحبو' افتخار عارف کو دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھو جب وہ اکیلا بیٹھا ہو۔ جب اسے یقین ہو کہ دور دور تک کوئی دیکھنے والا موجود نہیں۔ اس وقت اس کا سینہ شق ہو جاتا ہے اس میں سے ایک ٹوٹ نکلتی ہے ایک ویرانی ایک خلا۔ افتخار عارف کو جان لینا چاہئے کہ صرف ایک چیز ہے جو اسے اس خلاء کی دست بردے سے بچا سکتی ہے۔ تخلیق تخلیق مسلسل تخلیق۔

◆◆◆

مجاہد

(ڈاکٹر رشید امجد)

زندگی میں ایک مقام ہے جسے انگریزی میں "دی لینڈ آف نو ریٹرن" کہتے ہیں۔ ایک ایسا مقام جہاں ایک بار جا پہنچو تو واپسی ممکن نہیں رہتی۔

خال خال لوگ وہاں سے واپس آجانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ عزاز کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ہر کسی کو نہیں۔ رشید امجد وہ مجاہد ہے جو دی لینڈ آف نو ریٹرن سے واپس آگیا ہے۔ وہ تیر کر آیا ہے' میں بہہ کر آیا ہوں۔ وہ مجاہد ہے میں خوش قسمت ہوں۔

کسی نوجوان افسانہ نویس کی بات ہو رہی تھی۔ میرا دوست مسعود قریشی جو شاعر بھی ہے اور نقاد بھی' بولا۔

مفتی اس لڑکے کو کہو کہ افسانہ نہ لکھے۔

کیوں نہ لکھے۔ میں نے پوچھا۔

بولا اسے کہانیاں لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

کیوں حاصل نہیں ہے۔

کہانیاں لکھنے کا حق صرف اسے ہوتا ہے جو خود کانٹوں کی سیج پر سویا ہے' جس نے درخت کی وہ شاخ کاٹنے سے دریغ نہیں کیا جس پر وہ خود بیٹھا تھا' جو تذلیل میں لت پت ہوا ہے' جو نالیوں میں گرنے کی لذت سے آشنا ہے اور ایسی کیفیتوں کو بیت کر واپس آگیا ہے۔ مسعود سچ کہتا ہے۔ میرے جی کو بھی ان کیفیتوں کو بیتنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا مگر وہ واپس نہ آیا۔

منور کو یہ کیفیت اس قدر من بھا گئی کہ اس نے وہیں وڈیرہ لگا لیا۔

اس حوالے سے رشید امجد کو کہانی لکھنے کا حق حاصل ہے۔ آج رشید امجد کی کہانی حیرت سے بھری ہوئی ہے۔ زندگی کی پراسراریت اور اپنی واپسی پر وہ ابھی تک عالم حیرت میں ہوا ہے۔ یہ کیا ہوا ہے؟ کیوں ہوا ہے؟ کیسے ہوا ہے؟ وہ ابھی ایلس کی طرح ونڈر لینڈ میں ہے۔

کل جب حیرت ہائیں؟ سے واہ! میں بدل جائے گی تو علامت کی دھند چھٹ جائے گی اور اس کی کہانی بولے گی۔ کیا کیا دکھ درد کی دھنیں سنائے گی۔

سیانے کہتے ہیں انسان کو دو تین قسم کی طاقتیں عطا ہوئی ہیں۔ ایک کرنے کی طاقت' دوسری سہہ جانے کی طاقت۔ کرنے کی مرد کو عطا ہوئی' سہہ جانے کی عورت کو' سہہ جانے کی طاقت افضل تر ہے کیونکہ وہ جینے کو حوصلہ بخشتی ہے۔ ناساعد حالات میں جینے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ یہ طاقت بزرگوں کو عطا ہوئی۔ کشمیر ہاتو کو عطا ہوئی جو نہ جانے کب سے ناساعد حالات میں مر مر کے جیئے جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس حوالے سے رشید امجد ایک ہاتو ہے' مجاھد ہاتو۔

رشید امجد کی زندگی ''ہونی'' کے تحت گزاری ہے۔ ہونی ایک ایسا واقعہ ہے جسے واقعہ ہونا نہیں چاہیے مگر وہ ہو جاتا ہے۔ آپ کو پوچھے بغیر۔ بتائے بغیر آپ کی زندگی کو لٹ پٹ کر دیتا ہے۔

اس ہونی کے خلاف رشید امجد نے دہائی دی چیخ و پکار کی لیکن سنوائی نہ ہوئی۔ پھر تقدیر کی اس زیادتی اور اپنی بے بسی پر اس نے ایک انوکھے احتجاج کا سہارا لیا۔ ایسا احتجاج جیسے بچے کیا کرتے ہیں کہ سارا نہیں دیتے تو سارا آدھا بھی لے لو۔ رشید امجد نے خود کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی موم بتی دونوں سروں پر جلالی۔ اندر کی سلگن کو ہوا دے کر بھانبھڑ بنا دیا۔

قدرت کی شعبدہ بازی کا بھی شمار نہیں۔ سانپ آتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ لکیریں چلتی رہتیں ہیں' چلتی رہتیں ہیں۔ ہونی کا سانپ آیا اور نکل گیا لیکن لکیروں نے سالہا سال رشید امجد کو جکڑے رکھا۔ سیانے کہتے ہیں یہ لکیریں جاتی نہیں بلکہ قائم ہو جاتی ہیں اور پھر چلتی ہیں۔ رینگ رینگ کر چلتی ہیں۔ زندگی بھر رینگتی رہتی ہیں۔ آپ کے گرد حلقہ تنگ کئے جاتے ہیں اور تنگ اور تنگ۔ اس حوالے سے رشید امجد کی کہانی بڑی دکھی ہے۔ سالہا سال ہوئے سانپ آیا اور نکل گیا۔ لکیریں اب بھی رینگ رہیں ہیں۔ رشید امجد کو گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ صاحبو ہم سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ سانپ نہیں آیا مگر لکیریں لگائے بیٹھے ہیں۔

یہ لکیریں شخصیت کی کیوس کے اندر چیونٹیوں کی طرح دھنس جاتی ہیں اور جگہ جگہ گھر بنا لیتی ہیں۔ باہر ساکن اندر حرکت ہی حرکت پیہم حرکت۔ مسلسل کھتر پتھر۔ انسانی شخصیت عجب گورکھ دھندا ہے جس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ کسی نے ایک درویش سے پوچھا کہ بابا جی انسانی شخصیت کیا شے ہے؟ درویش بولا۔

میاں ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے بارہ دری سی چیز ہے۔ دروازے ہی دروازے دروازے۔ کچھ باہر کھلتے ہیں کچھ بھیتر کچھ کھلے میں کچھ ادھ کھلے کچھ بند۔ پوچھنے والے نے پھر پوچھا۔

''کیا خود بند کیے ہیں''؟ درویش نے کہا۔

''کچھ ازلی بند ہیں'' کچھ خود بند کیے ہیں کہ بھید نہ کھلے' کچھ چوڑ چپٹ کھول رکھے ہیں کہ خلق خدا کی آنکھوں میں دھول جھونکیں''۔

درویش کے حوالے سے دیکھیں تو رشید امجد کے دروازے کچھ زیادہ ہی کھلے ہیں۔ ایوان خاص جیسے نہیں۔ پنڈ و دالان جیسے دروازے۔ اگرچہ خود کو ناقد محقق اور دانشور سمجھتا ہے لیکن رشید امجد دراصل بڑا ہی سادہ آدمی ہے۔ پھر بھی نیم واہ راہ جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے رشید امجد کے اندر اور باہر کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

عام طور پر دانشوروں کے اندر اور باہر تربوز کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے تربوز باہر سے ہرے کچور اور اندر سے لال سو ہے۔ لیکن رشید امجد کا اندر باہر دونوں کدو کی طرح ایک جیسا ہے سپاٹ۔ اس لحاظ سے رشید امجد کا اندر اور باہر کدو کی طرح ایک جیسا سپاٹ ہے۔ اس طرح رشید امجد کی شخصیت رنگی ہوئی ہے نہ دورنگی نہ دورخی نہ دودھاری۔ ایک ویران سڑک پر کٹیا میں بابا کا ڈیرا تھا۔ گاؤں کے لوگ بابا کے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک روز ایک لمبی کالی سیاح کار ڈیرے پر آ کر رکی۔ دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون بری سج دھج میں کار میں بیٹھی تھی۔ بولی۔

بابا جی میرے لئے دعا کریں' چپ چاپ بابا غور سے خاتون کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

بی بی تو نے ریشم پہن رکھا ہے۔ ہیروں والے زیورات سے لدی پھندی ہے۔ اتنی لمبی کالی کار پر سوار ہے۔ تجھے اور کیا چاہئے؟ میں تیرے لئے کس چیز کی دعا کروں؟ خاتون گاری سے باہر نکل آئی بولی۔

رشید امجد اس خاتون کی مصداق ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے نیک نامی ہے' ہرت ہے' عزت ہے' عہد ہے' وہ تخلیق کار ہے' اردو ادب میں سے ایک مقام حاصل ہے' لیکن دل میں ایک پھانس لگی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ اس کی کہانیوں میں ایک بے نام تشنگی ہے۔ سانپ گزر چکا ہے۔ لکیریں رنگ رہی ہیں۔ شعور میں نہیں لاشعور میں گھوم رہی ہیں۔ لاشعور میں ایک زیر لبی ابھرتی ہے۔

مشکل	آسان	ہوئی	چاہتی	ہے؟
کیوں	پریشاں	ہوا	جاتا	ہے

رشید امجد کی کہانی بڑی تکلیف دہ ہے۔ دکھ بھری ہے لیکن بڑی ہی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کہانی کو پنجابی میں ''ہونی'' کی کہانی کہا

جاتا ہے۔ہونی آتی ہے۔بے وجہ بے جواز اور بے مقصد اور کیسے ہو جاتی ہے۔ پھر ایک گرداب' ڈب جھلکے' مسلسل ڈب جھلکے' انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ مار مار کر ہار جاتا ہے۔اس عذاب سے بچنے کے لئے ڈوب جانے کی آرزو کرتا ہے۔اور ڈوب جاتا ہے۔

رشید امجد نے سولہا سال خوب جھلکے کھائے۔ پھر ڈوب جانے کے جنون میں اپنے جسم سے پتھر باندھ لئے۔ پھر پتا نہیں کیسے ہوا۔ ہونی نے اسے اگل دیا۔ جیسے حضرت نوح اعلیہ اسلام کو مچھلی نے اگل دیا تھا۔ پتہ نہیں آیت کریمہ کا ورد کس نے کیا تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ وہ ڈوبنے کی بجائے کنارے پر جالگا اور یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ آج رشید امجد یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیسے کنارے جالگا۔ اس کے دل میں شکر گزاری کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ اسے یہ شکایت ہے کہ وہ کیوں ڈب جھلکے کھاتا کیوں ہونی آئی اور ہو گئی۔

رشید امجد سری نگر کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشمو چراغ ہے جو بارہ سال کی منتوں کے بعد پیدا ہوا اور سارے گھر کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ اس مندر کا واحد دیوتا تھا۔ صرف ماں باپ ہی نہیں سب مور چھل کرتے تھے۔ آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب رشید امجد سات سال کا ہوا تو اس کے والدین پنڈی میں رشتے داروں سے ملنے کے لئے آئے ان کے یہاں پہنچتے ہی مملکت پاکستان کے قیام کا علان ہو گیا۔ راستے بند ہو گئے۔ سرحدوں پر مسلمانوں کے خون کی ندیاں چلنے لگیں۔ رشید کے والد کا واپسی جانا ناممکن تھا۔

ان دنوں پاکستان دردزہ سے گزر رہا تھا۔ افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ رشید امجد اور اس کے والدین اس افراتفری اور نفسا نفسی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ والد نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی بہت کوششیں کیں۔ دکان کھولی نہ چلی' قالینوں کا کاروبار کیا دیوالیہ ہو گیا۔ مسلسل ناکامیوں نے کمر توڑ دی' جان بر نہ ہو سکا۔ والدہ اکیلی رہ گئی۔

رشید امجد نے دسویں کر لی۔ کالج جا کر ضبط کھو بیٹھا۔ تعلیم چھوڑ دی' آوارگی کو اپنا لیا۔ ایک انتہائی شدتی چار یاری بنالی۔ غنڈہ گردی کے چاٹ لگ گئی۔ شدت کا یہ عالم تھا کہ گھر فاقے تھے۔ باہر کیمل سڑنگ سگرٹ چلتا تھا۔

پھر شدت وحشت تک جا پہنچی۔ سگرٹ ہاتھ پر بجھانے لگا۔ ہاتھ کے زخم کو بڑے پیار سے ہرہ رکھتا۔ اس کی یوں نمائش رکھتا جیسے چھاتی پر لگا تمغہ ہو۔ یہ خود کو بھسم کر دینے کی خواہش کا ڈھکا چھپا اظہار تھا۔ اس دور میں رشید کی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی۔ باہر غنڈہ گردی آوارگی اندر ماں کا دیوانہ وار لاڈلا پیارا۔ یہ لاڈ عام لاڈ پیار نہ تھا۔ رشید کی آوارگی کی وجہ سے ماں ڈوب رہی تھی۔ اس کے لئے رشید واحد تنکا تھا۔ وہ بری طرح اس تنکے کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ دونوں جانب شدت کے بھبھاکے تھے۔ باہر بھی اندر بھی کہتی ماں بیٹا

جلدی گھر آ جانا۔ ماں کی بات رشید میں عمل نہیں ردعمل پیدا کرتی تھی۔ وہ رات کے دو تین بجے گھر آتا تھا۔ ماں راہ دیکھتی رہتی۔ دونوں ہی مجبور تھے' معزور تھے۔ ماں کو راہ دیکھنے کی لت پڑی تھی۔ رشید کو یہ کہ کوئی راہ دیکھے۔ ماں کا سارا زیور بک گیا تو رشید کو نوکری کرنی پڑی۔ پہلے گھریلو ملازم بنا' پھر ورکشاپ میں مستری' پھر ورکشاپ میں کلرکی مل گئی۔ وہاں ایک ایسا ساتھی مل گیا جو خود ٹوٹا ہوا تھا لیکن خود کو بنانے کا جنون سر پر سوار تھا۔

کہتے ہیں دیا دیے سے جلتا ہے۔ رشید امجد اور اعجاز دونوں ہی بجھے ہوئے دیے تھے۔ پتہ نہیں کس نے ان میں روشن ہونے کی آرزو پیدا کی۔ رشید میں بھی کچھ بننے کی آرزو جاگی۔ آوارگی تو رہی لیکن رخ بدل گیا۔ اک کایا پلٹ عمل میں آئی۔ ایسے ہی جیسے کبھی ہونی آئی تھی۔ رشید امجد کے اندر کا ہاتو مجاہد جاگ اٹھا۔ ہاتو میں مرمر کے جیئے جانے کی شکتی ہوتی ہے۔ ہاتو کشمیر کی مسلسل جدوجہد کا سمبل ہے۔ اگر ہاتو نہ ہوتا تو آج کشمیر صدیوں کے جور و استبداد تلے دم توڑ چکا ہوتا۔ ہاتو جاگا تو رشید امجد کی ساری شدت مشقت میں ڈھل گئی۔

پرائیویٹ ایف اے کیا' بی اے کیا' ایم اے کیا' پی ایچ ڈی کی۔ حیرت ہے کہ وہ کہاں سے چلا' کہاں آ پہنچا۔ جس پھسلن میں وہ پھنسا تھا وہاں تو ایک قدم کا قیام ممکن نہ تھا۔ پھر وہ قدم قدم اتنی دور کیسے آ پہنچا۔

جوں جوں وہ Rehabilitate ہوتا گیا توں توں اس کی وحشت جھڑتی گئی۔ تخریب تعمیر میں بدلتی گئی۔ پھر Recognition نے اسے بھرپور قیام عطا کر دیا۔ صاحبو ہم Recognition کے کس قدر محتاج ہیں۔ تعمیر میں نہ ملے تو تخریب میں ڈھونڈتے ہیں۔ خود کو بنا کر حاصل نہ کر سکیں تو خود کو تباہ کرنے پر تل جاتے ہیں۔

بے شک رشید امجد ایک تخلیق کار کی حیثیت سے قیام حاصل کر چکا ہے۔ سانپ نکل گیا ہے لیکن لکیریں آج بھی رینگ رہی ہیں۔ اس نے ان رینگتے مکوڑوں کو اپنے شعور سے نکال دیا ہے۔ لیکن وہ اس کے لاشعور میں دبک کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس لیے اس کے شعور اور لاشعور میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی۔

رشید امجد آج بھی انجانے عالم میں حیرت زدہ ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا' کیوں ہوا؟ یہ ہونی کیا ہوتی ہے؟ کیوں ہوتی ہے؟ کیوں ہو جاتی ہے؟ کیا بھید ہے؟ اس کی تخلیقات زندگی کی پراسراریت کی طرف اشارے کرتی ہیں۔

اس کے ساتھی حیران ہوتے ہیں کہ یہ رشید امجد کیسا افسانہ نویس ہے۔ نہ افسانہ سوچتا ہے نہ اسے ذہنی طور پر بیتتا ہے۔ نہ کڑیاں جوڑنے کا تردد کرتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ گپ بازی بھی کرتا رہتا ہے' ساتھ افسانہ بھی لکھتا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لاشعور کے زور

پر افسانہ لکھتا ہے۔ شعور کے زور پر بیٹھ کر اسے کھینچنا پڑتا ہے۔ رشید امجد شعوری تگ ودو سے بے نیاز ہے۔ جبھی اس کے افسانوں میں زندگی کی پراسراریت کا عنصر موجود ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟

لکیریں چل رہی ہیں۔

◆◆◆

معزز

(منشا یاد)

منشا یاد جب اسلام آباد میں آیا تھا تو وہ ایک فرد تھا۔ اب وہ ایک ادارہ ہے۔ اس کے متعلق بھانت بھانت کی باتیں مشہور ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

کوئی کہتا ہے کہ اسلام آباد افسانے کا شہر ہے اور منشا یاد اس کا صدر دروازہ ہے۔

کوئی کہتا ہے منشا یاد ذات کا معمار ہے۔ تنخواہ سی ڈی اے سے لیتا ہے لیکن اسلام آباد میں تعمیر ادب کی کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے منشا یاد پی آر کے زور پر ادیب بنا ہے' اس نے اپنا مکان ادیبوں کا ٹی ہاؤس بنا رکھا ہے۔ کوئی کہتا ہے منشا یاد اسلام آباد کے ادبی حلقوں کی ڈائریکٹری ہے۔ ادیبوں کا کہنا ہے کہ افسانہ نویس گنتی کے حساب سے افسانے لکھتے ہیں۔ منشا یاد سیروں کے حساب سے افسانے لکھتا ہے۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ منشا یاد افسانہ نویسوں میں چمگادڑ سمان ہے' علامتیے کہتے ہیں کہ ہم میں سے ہے' روایتیے کہتے ہیں کہ ہم میں سے ہے۔

ایک دانشور کہتا ہے' آج کا دستور ہے کہ نام ہو کام چاہے ہو نہ ہو۔ یہ منشا یاد کیا عجوبہ ہے کہ نام بے معنی ہے کام بامعنی ہے۔

بہر صورت ایک بات یقینی ہے کہ اسلام آباد میں آلودگی کی تمام تر ذمہ داری منشا یاد پر عائد ہوتی ہے۔

صاحبو یہ سنی سنائی نہیں آنکھوں دیکھی بات ہے۔

منشا یاد کی آمد سے پہلے اسلام آباد کی فضا میں بڑی خوشگوار ہم آہنگی تھی۔ یہاں بیگمات تھیں' صاحب تھے' بیرے تھے' خانسامے تھے' بنگلے تھے' باغ تھے' سر جی تھے' جی حضوریے تھے۔ اس آرکیسٹرا میں سب شدھ سر تھے' Confirmist تھے۔ منشا یاد نے آتے ہی شہر میں گھوم پھر کر کونوں کھدروں سے Non-Confirmist کو جنہیں عام زبان میں ادیب کہتے ہیں' اکٹھا کر لیا۔ ادبی محفلوں کی رسم ڈالی۔ ادیبوں کو اپنی گاڑی میں ڈھوڈھو کر محفلیں جمائیں۔

ابتداء میں یہ محفلیں نیشنل سنٹر میں ہوتی تھیں۔ پھر منشا یاد نے سی ڈی اے کے معصوم صاحبوں کو ورغلایا۔ انہیں کہا کہ سر جی بنگلے

تعمیر کرنے سے شہر نہیں بنتے۔اگر صاحبوں کی اس کالونی کو شہر بنانا ہے تو یہاں کلچر کے فروغ کی چیزیں بنائے' جہاں لوگ اکٹھے ہوں' مل بیٹھیں۔اپنی بات کو تقویت دینے کے لیے اس نے ریفرنس کے طور پر شعر پڑھ دیا کہ جناب والا شاعر کہتا ہے۔

''پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا''

سی ڈی اے کے صاحب منشایاد کے بہکاوے میں آ گئے۔انہوں نے اقبال ہال بنا دیا۔منشا نے ہال کا ایک کمرہ ادبی محفلوں کے لیے مخصوص کروا دیا۔صاحبوں کو شعور نہ ہوا کہ منشا یاد اسلام آباد میں Non-Confirmist یعنی میں نہ مانوں سپرٹ کو ہوا دے رہا ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ ادبی محفلیں فائیو اسٹار ہوٹلوں تک جا پہنچی ہیں۔

شخصیت کے لحاظ سے منشا یاد دورنگی ہے۔بیک وقت اس کی شخصیت سرخ بھی ہے اور سبز بھی۔اس میں قیامت بھی ہے اور حرکت بھی۔پانی بھی ہے اور مٹی بھی۔مادہ بھی ہے اور انرجی بھی۔اس کی شخصیت فنکارانہ بھی ہے اور غیر فنکارانہ بھی۔ان دونوں شخصیتوں میں کوئی ربط نہیں بلکہ تضاد ہی تضاد ہے۔ایک میٹھی ہے دوسری پھیکی۔وہ دونوں آپس میں ملی جلی ہیں مگر ایسے کہ ایک دوسری پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔سوکنیں ہونے کے باوجود آپس میں لڑتی جھگڑتی نہیں۔یوں گھر میں یک جہتی کی فضا قائم رہتی ہے۔

یہ حیرت کی بات ہے۔

لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو حیرت انگیز مخلوق پیدا کرنے سے بڑی دلچسپی ہے۔قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ اور شور اور ان دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ایک رکاوٹ ہے جو ان دونوں کو گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

مثلاً بحیرۂ روم اور بحر اوقیانوس آبنائے جبرالٹر کے ذریعے ملے ہوئے ہیں۔لیکن دونوں سمندروں کی اپنی اپنی کیفیات دائم و قائم ہیں۔بحیرہ روم کی اپنی حرارتی کیفیات ہیں' اپنا نمکیاتی تناسب ہے اور بحر اوقیانوس کی اپنی کیفیات ہیں۔ملے ہوئے ہونے کے باوجود ان کی کیفیات گڈمڈ نہیں ہونے پاتیں۔

یہ میں نہیں کہہ رہا یہ آج کے سائنس دان کہہ رہے ہیں۔وہ حیران ہیں کہ اس بات کا ہمیں آج علم ہوا ہے لیکن قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس کی نشاندہی کی تھی۔یہ تو تھی سمندروں کی بات۔

انسانی شخصیات میں ایسی حیران کن باتیں عام پائی جاتی ہیں۔یوں سمجھ لیجئے کہ منشا یاد کی شخصیت دومونہی سانپ جیسی ہے۔عام سانپ کے ایک سرے پر سر ہوتا ہے اور دوسرے سرے پر دم۔دومونہی سانپ کے دونوں سروں پر سر ہوتا ہے۔جب وہ چاہتا ہے

ایک سر کو اٹھا کر ادھر چلنے لگتا ہے جب چاہتا ہے دوسرے سر کو اٹھا کر ادھر چلنے لگتا ہے۔

نفسیات کی رو سے فنکار کی شخصیت میں الجھاؤ ہوتے ہیں۔ٹیڑھ میڑھ ہوتے ہیں' بھنبھیریاں چلتی ہیں۔

فنکار انٹروورٹ ہوتا ہے۔اپنی ''میں'' میں ڈب جھلکے کھاتا رہتا ہے۔اس میں ضبط نہیں ہوتا۔قیام نہیں ہوتا حساسیت اور شدت کی وجہ سے بے چین رہتا ہے وہ پریکٹیکل نہیں ہوتا۔عمل سے گریزاں رہتا ہے۔زندگی میں ول ایڈجسٹڈ نہیں ہوتا۔اسی وجہ سے فنکار کی شخصیت کو ٹیڑھی لکیر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

یہی بات میرے لیے باعث حیرت ہے کہ منشایاد فنکار ہونے کے باوجود سیدھی لکیر ہے جیسے فٹے سے لگائی گئی ہو۔

منشایاد ایک معقول آدمی ہے'Extrovert ہے' پریکٹیکل ہے'عمل کا قائل ہے۔رسمی معززیت کا دلدادہ ہے' سوشل ہے۔زندگی میں Well ایڈجسٹڈ ہے۔

منشایاد شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔وہیں پلا۔ابتدائی تعلیم حاصل کی۔وہ اپنے گاؤں کا واحد تعلیم یافتہ فرد ہے جو مرکزی حکومت میں عہدے پر فائز ہے۔

اپنی تعلیم اور کردار کی وجہ سے وہ گاؤں میں معزز ترین فرد سمجھا جاتا ہے۔گاؤں والے اس کی بے حد عزت کرتے ہیں۔اس کی بردباری نیک نیتی اور بے لاگ لگاؤ میانہ روی کی وجہ سے گاؤں والے اس کے ہر مشورے کو حکم کا درجہ دیتے ہیں۔جس کی تعمیل کرنا لازم ہے۔گاؤں میں بڑے سے بڑا جھگڑا اس کی سفارش پر ختم کر دیا جاتا ہے اور دونوں پارٹیاں خوش دلی سے راضی نامے پر تیار ہو جاتی ہیں۔

اسی وجہ سے منشایاد کے چہرے پر معززیت اور سنجیدگی کے دبیز پردے پڑے رہتے ہیں۔جن کی وجہ سے اس کا چہرہ گونگا ہے اور اس کی Sense of Prestage زود حس ہے۔

یہی اس کی شخصیت کا سب سے بڑا تضاد ہے۔اس کا کردار روایت زدہ ہے۔لیکن اس سوچ اور فن انفرادیت کے حامل ہیں۔

اس کی زندگی دو محوروں پر گھومتی ہے۔رسم و روایت اور فنی انفرادیت۔

میری بہو نے منشایاد کا ایک افسانہ پڑھا۔بڑی متاثر ہوئی۔مجھ سے کہنے لگی۔یہ منشایاد خوب لکھتا ہے۔میں نے کہا' خوب نہیں بہت خوب لکھتا ہے۔

اتفاق سے اسی روز منشایاد آ گیا۔تہمینہ نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا۔جب وہ چلا گیا تو کہنے لگی' یہ تھا منشایاد؟ میں نے کہا۔یہی منشایاد

تھا۔

بولی۔ وہ افسانہ اس نے لکھا تھا؟ نہیں میں نہیں مانتی۔ یہ شخص وہ افسانہ نہیں لکھ سکتا۔

میں نے کہا' وہ افسانہ باہر کے منشایاد نے نہیں لکھا' اندر کے منشایاد نے لکھا ہے۔

بولی۔ اندر اور باہر میں اتنا فرق۔

میں نے کہا' ہاں یہ باہر کا منشایاد ایک گھریلو آدمی ہے۔ گھر کے سودے خود لاتا ہے۔ بہت بڑا منتظم ہے۔ دفتر میں بڑا انتظامی افسر ہے۔ بڑا قابل اعتماد فرد ہے۔ جملہ دوستوں سے رسمی میل جول رکھتا ہے۔ رکھ رکھاؤ کا رسیہ ہے۔ چہرے پر معززیت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

بولی۔ اتنا بے حس گونگا چہرہ۔

میں نے کہا' پیاری معزز چہرے بے حس ہوتے ہیں۔

فنکار ہونے کے باوجود منشایاد ایک گھریلو آدمی ہے۔ گھر کے سارے کام خود کرتا ہے۔ اگرچہ بیٹے جوان ہو چکے ہیں۔ برادری کی ہر رسم میں شمولیت کرتا ہے۔ ہر رواج کو نبھاتا ہے۔ گھر میں ہیڈ آف دی فیملی کی طرہ دار دستار باندھے رکھتا ہے۔

دفتر میں وہ یوں کام کرتا ہے جیسے پیدائشی کلرک ہو' اگرچہ افسر ہے لیکن رویہ مسٹر جان کا سا ہے۔ مسٹر جان ایک بڑے صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ بڑے صاحب نے پوچھا' مسٹر جان! آپ نے یہ رپورٹ دیکھ لی؟ یس سر۔ مسٹر جان نے جواب دیا۔

بڑے صاحب بولے۔ ''آپ اس پر نظر ثانی کر لیں۔'' مسٹر جان نے کہا۔ ''سر جس چیز کو جان ایک بار دیکھ لے اسے نظر ثانی کی ضرورت نہیں رہتی۔''

منشایاد نے اپنے افسر اعلیٰ سے کہا۔ سر ایک بات یاد رکھئے کہ منشایاد کی میز پر کوئی کاغذ یا فائل کبھی Pending نہیں رہتا۔ یقین نہ آئے تو آزما دیکھئے۔

منشایاد نے بڑی دیر تک دفتر والوں سے یہ بات چھپائے رکھی تھی کہ وہ ادیب ہے۔ وہ ڈرتا تھا کہ افسروں کو پتہ چل گیا تو وہ بات بات پر طعنہ دیں گے کہ چھوڑو منشایاد کی کیا بات کرتے ہو' وہ تو کہانیاں لکھنے والا ہے۔

مجھے یاد ہے' تقسیم سے پہلے ایک انگریز افسر نے مجھے اپنے دفتر میں اسامی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کہنے لگا' اچھا تو آپ افسانہ نویس ہیں۔ معافی چاہتا ہوں' ہمیں دفتر میں کام کرنے والوں کی ضرورت ہے' Immagination والے ڈسپلن کو خراب کرتے

ہیں۔منشایاد کا کردار ویسے تو بڑا مستحسن ہے لیکن اس میں ادیبانہ شان نہیں ہے۔

میرے ایک عزیز دوست شاعر تھے۔ان کی بیوی حاملہ تھی۔آخری دن تھے۔انہوں نے از راہ ہمدردی بیوی سے کہا' بیگم آج آپ کھانا نہ پکائیں میں ابھی بازار سے کھانا خرید لاتا ہوں۔

اگلے دن جب وہ گھر واپس آئے تو نوزائیدہ بچہ پنگھوڑے میں پڑا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

میرے ایک اور دوست جو جانے پہچانے شاعر تھے دفتر کے کام میں بڑے ماہر تھے۔وہ از خود دفتر نہیں آیا کرتے تھے۔ہر دوسرے تیسرے دن ان کے ہم کار انہیں ڈھونڈ کر' تانگے میں ڈال کر دفتر لایا کرتے تھے۔اپنی میز پر بیٹھ کر وہ ہوش میں آجاتے اور پھر دنوں کا کام گھنٹوں میں ختم کر دیتے۔

منشایاد کی ادب دوستی اور ادیب نوازی نے ہمیں بری طرح زچ کر رکھا ہے۔لوگ ہم سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہم بھی ان سے منشایاد اک سا سلوک کریں۔منشایاد کا ڈرائنگ روم ادیبوں کا ریسٹ ہاؤس بھی ہے اور ریستوران بھی۔اس کی بیوی ادیبوں کے لیے چائے بناتی بناتی بوڑھی ہوگئی ہے۔

منشایاد ذات کا انجینئر ہے لیکن اس کی گاڑی سے انجینئروں کی نہیں بلکہ ادیبوں کی بو آتی ہے چونکہ اس نے ادیبوں کو ڈھونے کا کام اپنا رکھا ہے۔گھر سے محفل تک محفل سے گھر تک۔

منشایاد کی نوٹ بک میں ادیبوں کے اپ ٹو ڈیٹ پتے فون نمبر اور دیگر کوائف ریکارڈ کیے ہوتے ہیں۔اس وجہ سے ہم سب اسے ادبی انسائیکلو پیڈیا سمجھتے ہیں۔

یہ ادب دوستی کی بیماری بہت پرانی ہے۔۱۹۶۰ء میں جب وہ اسلام آباد میں آیا تو یہاں ادبی اور ثقافتی ایکٹویٹی کا فقدان تھا۔منشا یاد نے یہاں کے ادیبوں کو اکٹھا کیا اور بزم ادب کی بنیاد ڈال دی۔ ۱۹۷۲ء میں اس نے حلقہ ارباب ذوق کا اجراء کیا۔پھر سی ڈی اے سے کہہ کر اقبال ہال میں ایک بڑا کمرہ ادبی محفلوں کے لیے مخصوص کرا دیا۔اسلام آباد میں ادبی ایکٹویٹی کو وقار بخشنے کے لیے وہ باری باری ہر سینئر ادیب سے ملا اور انہیں محفل میں شمولیت پر راغب کیا۔پھر اس نے کتابوں کی رونمائی کے لیے بزم کتاب کا اجراء کیا۔

جب بات چل نکلی تو شہرت پسند لوگ مونچھ مروڑ کر میدان میں آگئے۔دقت یہ تھی کہ یہ لوگ صرف شہرت کے طالب تھے' کام سے جی چراتے تھے۔اس لیے ان سے بات نہ بنی۔ادھر منشایاد نام کا نہیں بلکہ کام کا دلدادہ تھا۔

کام کے حوالے سے میں نے منشایاد سا حریص آدمی نہیں دیکھا۔اسے ادب میں اونچا مقام حاصل کرنے کا جنون ہے اور اونچا اور اونچا اور اس بات کا شعور نہیں کہ ادب میں وہ ایک اونچا مقام حاصل کر چکا ہے۔اور اس کا شمار چوٹی کے افسانہ نویس میں کیا جا رہا ہے۔

اتنی چھوٹی عمر میں اس کے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔اسکے ڈیسک میں رسائل میں چھپی ہوئی کہانیاں اتنی تعداد میں موجود ہیں جن کے دو مجموعے بن سکتے ہیں۔اس کے ذہن میں افسانے یوں پھوٹتے ہیں جیسے برسات میں خودرو کھمبیاں اگتی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی ایک غیر مطبوعہ افسانہ اس کی فائل میں لگا ہے۔ایک افسانہ وہ لکھ رہا ہے اور ایک افسانے کا پلاٹ اس کے ذہن میں بے تابی سے ''سینتاں'' مار رہا ہے کہ آ مجھے لکھ۔

منشایاد کے متعلق لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ علامتی افسانے لکھتا ہے۔مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔چونکہ اس کے افسانے سمجھ میں آتے ہیں۔البتہ منشایاد اپنے افسانوں میں علامت برتتا ضرور ہے۔لیکن علامتی ہونا اور بات ہے۔علامات برتنا اور بات۔

علامت برتنا قدیم فن ہے۔شعراء اور نثر نگار ہمیشہ اپنے مضامین کو علامت سے سجاتے رہے۔

منشایاد کی معصومیت ملاحظہ ہو۔اپنے چھٹے مجموعے ''درخت آدمی'' میں اس نے مظفر علی سید کے تنقیدی مضمون اسے اقتباس دیباچہ کے طور پر شامل کرلیا ہے۔یہ مضمون قومی زبان کے جنوری ۱۹۹۰ء کے شمارے میں چھپا تھا۔

مظفر علی سید بہت پڑھے لکھے دانشور اور پروفیشنل نقاد ہیں۔پروفیشنل نقاد میں چند ایک بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔

۱۔وہ West Qriented ہوتا ہے اور مغربی مفکروں کی آراء کو اپنے فکر کی بنیاد بنالیتا ہے۔

۲۔اس کا رخ تعمیری نہیں ہوتا اس لیے توجہ کمیوں اور کجیوں پر مرکوز رہتی ہے۔

۳۔اس کا رویہ Non Commital ہوتا ہے۔''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' کی مصداق۔وہ کھل کر بات نہیں کرتا۔اس لیے تحریر میں ''روکو مت جانے دو'' قسم کے جملے عام ہوتے ہیں۔

۴۔خود کرسی پر بیٹھ کر مصنف کو سامنے کھڑا کر لیتا ہے اور اپنے فیصلے یوں سناتا ہے جیسے وہ حتمی سچائی کے آئینہ دار ہوں۔

مظفر علی سید نے اپنے مضمون کا عنوان رکھا ہے۔''منشایاد۔۔۔۔۔۔۔کاریگر افسانہ نگار''

ظاہر ہے کہ مظفر علی سید کی نگاہ میں افسانہ نویس فنکار نہیں بلکہ ایک ٹیکنیشن کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس بات کی وہ خود وضاحت کرتے ہیں۔لکھتے ہیں کہ قصہ گوئی کا ہنر بھی کاریگرانہ ابلاغ کی ایک صورت ہے۔مظفر علی سید اپنے

مضمون کی ابتدا جرمن مفکر کے اس قول سے کرتے ہیں کہ۔۔۔۔۔۔۔۔ "کہانی کہنے کا فن آخری دموں پر ہے۔ مظفر علی سید کا کہنا ہے کہ آج کل کا افسانہ نویس اپنی انا کا پرچم اٹھائے پھرتا ہے اور جدید افسانہ سطحی اور نمائشی دانشوری کی دین ہے۔

سیانے کہتے ہیں اگر کسی موضوع سے آپ کو دلی ہمدردی نہیں ہے تو اس موضوع پر لکھنے کا آپ کو کوئی حق حاصل نہیں۔

مظفر علی سید اس مضمون میں منشا یاد کی تحریروں کی تعریف تو کرتا ہے لیکن Reservation کے ساتھ۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ ڈنڈی مار رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ مظفر علی سید نے یہ مضمون اپنی انا کا پرچم لہرانے اور اپنی دانش وری کا رعب جمانے کے لیے لکھا ہے۔ لیکن مظفر علی سید کا یہ مضمون ایک الگ موضوع ہے۔ منشا یاد کی معصومیت کا بھی جواب نہیں جس نے ایسے مضمون کے اقتباسات کو اپنی کتاب میں جگہ دی۔

میری دانست میں منشا یاد واحد افسانہ نویس ہے جو ہمیں ہمارے دیہاتی عوام کے جذبات سے آگاہی دلاتا ہے۔ ہمیں اپنی روایات اور شناخت کی یاد دلاتا ہے۔

City Oriented ہونے کی وجہ سے ہم اپنی روایات سے کٹ گئے ہیں۔ ہمارا کلچر کھچڑی کلچر بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارے دانشور West Oriented ہونے کی وجہ سے مظفر علی سید بن گئے ہیں۔

اپنی فوک وزڈم کو ہم بھلا چکے ہیں۔ ترقی پسندوں نے مسلسل پروپیگنڈہ سے ہمیں یقین دلا دیا کہ ہمارے عوام مل مزدور ہیں۔ ہمارے اخبار عوام کے نمائندے بنے بیٹھے ہیں۔ ہمارے سیاستیوں کے نزدیک عوام وہ ہیں جو نعرے لگانے اور ووٹ دینے کے کام آتے ہیں۔

منشا یاد وہ واحد افسانہ نویس ہے جو ہمیں اپنے اصلی دیہاتی عوام کے جذبات سے آگاہ کرتا ہے۔ اپنی لوک روایات کی یاد دلاتا ہے جو ہماری شناخت ہیں۔

◆◆◆

خوش گفتار

(ضیا جالندھری)

وفات سے چار ایک سال پہلے ایک دن قدرت اللہ شہاب نے مجھے جون کیا۔ کہنے لگے۔ ''مفتی صاحب! کل آپ فارغ گے کیا؟''

میں نے پوچھا ''بات کیا ہے؟''

بولے ''اگر آپ کو فرصت ہو تو کل ضیا جالندھری سے مل آئیں۔''

میں نے کہا ''کس خوشی میں؟''

بولے ''I want to pay homege to him''

میں حیران ہوا۔ پوچھا ''کس بات پر؟''

بولے۔ ''مجھے شعور نہیں تھا کہ وہ بڑا شاعر ہے۔ آج شدت سے احساس ہوا ہے۔''

اس رات میں نے ضیاء کا مجموعہ تلاش کیا۔ اسے پھر سے پڑھتا رہا اور مجھے احساس ہوا کہ شہاب ٹھیک ہی کہتا ہے۔

یہ تو مجھے پتہ تھا کہ ضیاء اونچے شاعروں میں سے ہے۔ لیکن اتنا بڑا میں بھی نہیں سمجھتا تھا۔

صاحبو! اللہ کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ کیسی کیسی ادا سے دیتا ہے۔

ایک کو دیتا ہے تو کہتا ہے دین بھرپور ہو۔ لیکن واہ واہ دبی دبی رہے ایک کو دیتا دیتا کچھ نہیں۔ کہتا ہے خالی ڈھنڈورہ پیٹ دو۔

ضیاء کو دیا تو بھرپور دیا ہے لیکن ساتھ ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

نتیجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی سوجھ بوجھ والے قاری کو بیٹھے بٹھائے دفعتاً احساس ہوتا ہے۔ ارے یہ تو بڑا شاعر ہے۔ یوں بات زیر لب ہی رہتی ہے۔ البتہ جنہیں قدرت اللہ کی طرح عمل کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ وہ چپکے سے ''ہومیج'' ادا کرنے کے لئے ضیاء یاترا کر لیتے ہیں۔

جناب والا جالندھر نے بڑی بڑی عجیب وغریب شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ مثلاً میرے دوستو میں حافظ تھا۔ کلیم ہے فیضی ہے۔ ایچ یو بیگ ہے مجید ہے حافظ ہے مسعود ہے۔ ایک سے ایک نہیں ملتا۔ لیکن جالندھریت کی وجہ سے سب ملتے ہیں۔ ملتے رہتے ہیں۔ اتفاقاً نہیں التزاماً باقاعدہ ایک دوسرے ملتے رہتے ہیں۔

جالندھریے کو میل جول کا عارضہ لاحق ہے۔

جالندھریہ اجلا نہیں ہوتا۔ لکس صابون سے منہ دھو کر آئے تو بھی میلا میلا لگتا ہے۔ کلف زدہ نہیں ہوتا۔ دھوبی سے دھلے کپڑے پہنے تو بھی لگتا ہے جیسے گھر کے دھلے ہیں۔ جالندھیریے میں ٹیں نہیں ہوتی۔ موچھیں ہوں تو ہوں ان میں اکڑ نہیں ہوتی۔ لٹکی لٹکی رہتی ہیں۔

ضیاء کو دیکھئے اس میں لاہور ہے۔ کراچی ہے۔ اسلام آباد ہے۔ لیکن جالندھر نہیں ہے۔ خود کو جالندھری کہتا ہے اس لئے ہم مانے لیتے ہیں۔ ورنہ جالندھر کا رنگ نہیں۔

میرا ایک چھڈ یار دوست مسعود قریشی تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا بولا خبردار کو تو نے جالندھر کی شان میں گستاخی کی تو۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جالندھر بڑا زور اثر ہوتا ہے۔ ہڈیوں میں رچ بس جاتا ہے۔ اپنی مہر لگا دیتا ہے۔

میں نے کہا بھائی زیادہ غصہ نہ کھاؤ یہ لفافہ تو جالندھر کے ڈاک خانے سے مہر کے بغیر نکل گیا۔

مسعود غصے میں چلایا۔ کیا وہ ٹیلنٹیڈ نہیں ہے۔ میں نے کہا۔ ٹیلنٹ ہے ضرور لیکن ٹیلنٹ تو سیالکوٹی میں بھی ہوتی ہے۔

بولا خوش شکل نہیں کیا۔

خوش سکلی تو امرتسریوں کا وصف تھا۔ جالندھریوں میں خوش شکلی کہاں سے آئی وہ تو عوامی ٹھپے والا شہر ہے۔

بولا جذبات کی بھیک تو ہے نا میں نے کہا بھائی میرے وہ تو عقل کا مارا ہوا ہے۔ سوکھا کاٹھ۔ اور پھر ذرا میلا نہیں۔ اتنا اجلا جالندھریہ ہو سکتا ہے کیا۔

باہر سے دیکھو تو ضیاء کی شخصیت بالکل سپاٹ ہے جیسے دورویہ روشن بتیوں والے دوڑتی ہوئی سیدھی سڑک ہموار سڑک ہو نہ اچان نہ نچان۔ نہ جوڑ نہ موڑ۔

اس لہ شخصیت میں چار خصوصیات ہیں۔

خوش سکل، خوش پوش، خوش گفتار، خوش مزاج اس خاتون کی طرح جاذب نظر۔ جس کی تصویر کشی راگ ودھیا کے ایک بول نے کی

ہے۔

''مکھ موڑ مسکات جات''

بے شک مسکان دور کھڑے کو لوٹ لیتی ہے۔ دعوت دیتی ہے پاس بلاتی ہے۔ لیکن قریب جاؤ تو بھید کھلتا ہے کہ پاس روک نہیں سکتی۔ اپنا نہیں سکتی۔ اپنا بنا نہیں سکتی۔ شاید اس لئے کہ اپنا بنانے کے لئے خالی مسکان کافی نہیں۔ ساتھ تیور کا مزاج ضروری ہے۔ سیانے کہتے ہیں دوستی کی گٹھڑی ٹانگنے کے لئے سیدھ کیل کام نہیں آتا۔ ٹیڑھا میڑھا ہک درکار ہوتا ہے۔

ضیاء کی خوش گفتاری بظاہر بہت بڑی دین ہے۔ لیکن در پردہ بڑی محرومی ضیاء باتوں سے یوں بھرا پڑا ہے۔ جیسے شہد مٹھاس سے بھرا ہوتا ہے یا جیسے عوام سرکار کے خلاف شکایات سے بھرے ہوتے ہیں۔ آپ ضیاء سے کسی موضع پر بات کریں۔ ہر موضوع پر اس کے پاس کہنے کے لئے ایک بات موجود ہے۔ اس کا حافظہ اس قدر چوکس رہتا ہے جیسے پروگرام میں نعیم بخاری سے جھٹے چڑھا ہوا ہو۔ موقعہ اور مناسبت کے لحاظ سے ضیاء کی بات عین موزوں ہوتی ہے۔ انداز بیان اتنا شگفتہ کہ سامع بور نہیں ہوتا۔ چاہے بات پہلے کی سنی ہوئی ہو۔

اس کی رواں باتیں سن سن کر میں اس قدر متاثر ہوا کہ بار بار اسے کہتا رہا کہ یار تو اپنی یاداشتیں کیوں نہیں لکھتا۔ میں سمجھتا رہا کہ نثر اس کی زبان کی لونڈی ہے۔

پھر دفعتاً مجھے احساس ہوا۔ ارے ضیاء تو منہ زبانی ہے صرف منہ زبانی۔

صاحبو پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ لیکن ایسے ہوتا ہے کہ خوش گفتار لوگ منہ زبانی پھل پتیاں برساتے ہیں۔ پھلجھڑیاں چلاتے ہیں لیکن قلم ہاتھ میں اٹھائیں تو فیوز ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلا منہ زبنی جس کی شخصیت نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا۔ محمود نظامی تھا۔

محمود نظامی باتیں نہیں کرتا تھا پھلجھڑیاں چلاتا تھا۔ اس کی ہر بات مزاح کے رنگ میں رنگی ہوتی تھی۔ بات بات پر قہقہہ لگاتا۔ قہقہہ لگاتا تو آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اتنی بھیگ کہ لگتا جیسے آنکھ سے اب ٹپکا کہ اب ٹپکا۔

یوں قہقہے سے مل کر جلد ہی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ منہ زبانی ہے ضیاء سے کر مجھے شعور نہ ہوا۔ سمجھتا رہا کہ اس میں نثر نگاری کی بھرپور اہلیت موجود ہے۔ لیکن جسے شعر وسخن کی دین حاصل ہو وہ نثر نگاری کی طرف روجہ کیوں کرے گا جر کا حلوہ ہو تو گڑ کون کھاتا ہے۔

ویسے بھی ضیاء جالندھری میں جسم کے اجلے پن کے علاوہ ذہنی اجلے پن کا عارضہ بھی موجود ہے۔ ذرا سا احساس برتری۔ تھوڑی

سی اونچائی۔ لیکن ضیاء بہت چالاک ہے اس احساس برتری کو دکھنے نہیں دیتا۔ سمٹے رکھتا ہے۔ جناب والا اجلے پن کا احساس چاہے کیسا بھی ہو جسمی ہو ذہنی ہو روحانی ہو۔ دکھے بغیر نہیں رہتا۔

صاحبو اللہ نہ کرے کوئی اجلا ہو ساری دنیا میلی ہو جاتی ہے۔

بہر حال ایک زور بھید کھل گیا میں نے جان لیا کہ وہ منہ زبانی ہے۔ نثر نہیں لکھے گا۔ لکھے گا بھی تو متوازن ناقدانہ۔ وہ رنگینی نہیں ہو گی جو گفتار میں ہے۔

دوستوں نے مجبور کر کے محمود نظامی سے ایک کتاب لکھوادی تھی لکھتے ہوئے نظامی کتابی بن گیا۔ کتاب کا رعب چھا گیا نہ نظامی رہا نہ اس کی بات رہی نہ قہقہہ رہا نہ آنسو صرف کتاب ہی کتاب رہ گئی۔

صاحبو دعا کرو اللہ کتاب سے بچائے رکھے۔

ہلکی پھلکی بات کرنے نہیں دیتی۔ سیدھی بات کو الجھا دیتی ہے۔ لطافت میں کثافت گھول دیتی ہے۔ جذبات کی رنگینیوں کو تج کر سوچ کی گھمن گھیریوں میں ڈال دیتی ہے۔ عقل سکھاتی ہے۔ بڑے بڑے شاعر آئے فلسفی آئے۔ انہوں نے ہمیں خبر دار کیا کہ بھائیو۔ عقل ناقص چیز ہے۔ اس پر بھروسا نہ کرنا۔

ہم نے ان کی بات پر واہ واہ تو کی لیکن اعتبار نہ کیا۔ آج بھی ہم عقل کی لاٹھی کے سہارے کے بغیر قدم دھرنے سے ڈرتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھی جواب نہیں۔ یہ سارا تماشہ انہوں نے لگا رکھا ہے ایک طرف چھپنے کا شوق ہے ڈال ڈال پات پات میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دوسری طرف ظاہر ہونے کا شوق ہے۔ ڈال ڈال پات پات میں ظاہر ہیں۔

حسینوں کی طرح' صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ انہوں نے انسانی شخصیت بھی اپنے رنگ میں رنگی ہے۔ انسانی شخصیت ظاہر بھی ہے مستور بھی۔ یک رنگی نہیں۔ تضادات کی دھجیاں جڑی ہفت رنگی ہے۔ تضادات سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ اس ست رنگے پرزم کو یوں گھما رکھا ہے کہ صرف ایک رنگ دکھتا ہے۔ لیکن ضیاء کی دو رنگی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

اس کا کلام پڑھیے۔ پھر اس سے ملئے اس کی باتیں سنئے۔ فرق صاف ظاہر ہوگا۔ آپ محسوس کریں گے کہ وہ ایک نہیں دو فرد ہیں۔

ایک شاعر دوسرا فرد شاعر کا رنگ اور ہے فرد کا اور

شاعر گہرا ہے۔ ڈونگا ہے۔ فرد ٹریول لائٹ

شاعر دکھ ہے فرد خوش باش

شاعر آنسو ہے فرد قہقہہ

شاعر عاشق ہے فرد محبوب

فرد عقل کا مارا ہوا شاعر اڑان کا رسیا

شاعر بے نیاز۔ فرد دنیادار

شاعر کہتا ہے۔

''یہاں یہ میں ہی نہیں ہوں

مجھ سے یاں کئی ہیں

یہ کھو کھلے چہرے جن کی نظریں

فقط خلاؤں کو گھورتی ہیں

یہ لوگ ہنستے ہیں لیکن ان کی ہنسی میں رنگ طرب نہیں ہے۔''

فرد کی جانب دیکھئے۔ چہرا ابھرا ابھرا۔ نگاہیں جاذب اور طرب سے بھرپور قہقہہ شاعر کہتا ہے۔

''ہنسو اور اتنا ہنسو تم برس پڑیں آنکھیں

پھر اس سلگتے ہوئے آنسوؤں میں بہ جائے

وہ درد اور وہ دوری جو قہقہوں میں ہے۔''

صاحبو میں تو نثر نگار ہوں۔ ہم نثر نگار تو بیلی سوار ہیں۔ ہم اڑن کھٹولے میں سوار شاعروں کے بارے میں کچھ کہنے کی حثیت نہیں رکھتے۔ آپ ہی فیصلہ کریں فرد کی طرف دیکھئے نہ درد نظر آتا ہے نہ آنسو اور دوری کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرب ہی قرب ہے۔

تقسیم سے پہلے کی بات ہے جب میں ضیاء سے متعارف ہوا تھا ماہنامہ ہمایوں جوان دنوں ادب کا ٹاپ ناچ ہائی برو پرچہ تھا جس کا اڈیٹر حمید احمد خان ادب کا بیورو تھا۔ جو نئے ادیبوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ پیچھے ہٹ کر بات کرو۔ اس پرچے میں ضیاء کی چھوٹے چھوٹے جذبات سے رچی بسی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ یہ نظمیں منفرد تھیں جاذب توجہ تھیں۔

پھر ہمایوں میں اس کی تصویر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ کیسا شاعر ہے۔ اتنا قبول صورت۔ شاعر تو ونگے چبے ہوتے ہیں۔ اور میرے علم کے مطابق۔ لازم ہے کہ ہوں۔

قبول صورتی کا معمہ تو حل نہ ہوا۔ کلام کا مداح بن گیا۔ آج تک ہوں پھر پارٹیشن کے بعد راولپنڈی میں پہلی مرتبہ میں نے ضیاء کو دیکھا۔

صدر میں بابو بازار کی نکڑ پر ایک بڑی میلی حلوائی کی دوکان تھی درودیوار چیکٹے تھے۔ مٹھائیوں کے تھال ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ دکان کے سامنے بنے سجے ہارڈ کالر اور ٹائی میں ملبوس دو فرد ہاتھوں میں مٹھائی کی پلیٹیں اٹھائے باتوں میں محو تھے۔ بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اتنے اپ ٹو ڈیٹ لیکن گردو پیش سے اتنے بے نیاز۔ سٹیٹس کانشیس سے اتنی بے نیازی۔

میں نے اپنے ساتھی عزیز ملک سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ ملک بولا یہ ضیاء جالندھرا اور اس کا دوست خورشید ہیں۔

کرتے کیا ہیں میں نے پوچھ۔

سول سروس میں ہیں اس نے اس نے جواب دیا۔

میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔ اتنی جرات

مجھے قدرت اللہ شہاب یاد آ گئے۔

ایک دفعہ میں نے قدرت سے کہا۔ آپ کا اور میرا ساتھ مشکل ہے۔

بولے کیوں

میں نے کہا آپ بیوروکریٹ ہیں اور میں عوامی ہوں۔

کیا مطلب انہوں نے پوچھا۔

بولے میں بھی تو آزاد ہوں۔

میں نے کہا اگر آپ آزاد ہیں تو کراچی کے کسی پاش علاقے میں گنڈیریاں چوستے ہوئے ٹہل کر دکھا دیجئے۔

یہ سن کر شہاب خاموش ہو گئے کچھ دیر کے بعد بولے مشکل کام ہے لیکن چلئے کوشش کرتے ہیں۔

ضیاء اور خورشید کو یہ احساس ہی نہ تھا کہ وہ ایک مشکل اور جرات آزما کام کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ وہ میلی چکٹ دوکان پر یوں ایٹ ہوم محسوس کر رہے تھے جیسے انٹرکان کے بار کیو پر کھڑے ہوں۔

پھر اس بلبل جوڑے کو کئی ایک بار دیکھا۔ وہی کتر باتیں۔ وہی بھرپور قہقہے۔ وہی گردو نواح سے بے نیازی میں گہری سوچ

میں پڑا گیا۔ یا اللہ یہ ضیاء کیا چیز ہے۔ نہ شکل وصورت سے شاعر ہے نہ برتاؤ سے۔ لیکن ہے شاعر۔ بانکا شاعر پھر ضیاء ٹیلی ویژن کا میجنگ ڈائریکٹر بن کر اسلام آباد آ گیا اس کے آتے ہی ٹیلی ویژن کے چھتے میں بھن بھنم کا طوفان آ گیا۔

ایک بولا۔ سولہ آنے ڈاک خانے کا کلرک ہے افسری کرنی نہیں آتی۔ دوسرا بولا۔ بھئی یہ تو دو اور چار گنتا ہے۔ بالکل اکاؤنٹنٹ ہے اسے تو اے جی پی آر میں بھیجنا چاہئے تھا۔

تیسرا بولا۔ میں نہیں مانتا کہ یہ شاعر ہے کبھی شاعر بھی اصولوں کے پابند ہوتے ہیں۔

چوتھے نے کہا۔ یار یہ تو کرکٹ کے اوپنر کی طرح خالی ٹھپ ٹھپ کرن جانتا ہے۔ ٹی وی میں تو اسلم اظہر جیسا باؤنڈریاں لگانے والا چلتا ہے۔

پانچویں نے کہا ہاتھ کا بڑا تنگ ہے دونوں مٹھیاں بھینچ رکھی ہیں۔ انہیں کھولتا نہیں۔

چھٹا بولا یار۔ کمال کا آدمی ہے۔ اندر سے بڑا اسٹیشن کا شیس ہے لیکن ظاہر ہونے نہیں دیتا کرلو جو کرنا ہے۔

صاحبو آپ ٹی وی کو جانتے ہیں ٹی وی کے عملے کو نہیں جانتے ٹی وی ننگا پراپیگنڈہ ہے۔ عملہ ٹل پراپے گنڈا۔ ٹی وی شور مچا تا کر بھید کھول دیتی ہے۔ عملہ زیر لبی چلاتا ہے۔

ٹی وی جاٹ ہے اور عملہ دانشور

ٹی وی گلیمر ہے اور عملہ شہزادے

یہ عملے کا قصور نہیں۔ پروفیشن کا اثر ہے۔

شوبزنس کامیوں کو شہزادے بنادیتا ہے۔

ضیاء شاہد کی آمد پر عملے نے ایسی وہسپرنگ کمپین چلائی کہ ضیاء کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی۔

جب سرگوشیون کا گرد وغبار چھٹا تو عملے کے ذمہ دار لوگ بولے کہنے لگے دونوں ہی مجبور ہیں۔ شہزادے اصول اور قانون کی پابندی میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ ضیاء پوسٹ آفس سے آیا ہے اصول اور زنجیریں ساتھ لایا ہے۔

اگر چہ ضیاء نے ٹی وی کے عملے کو بونس دلایا۔ اور اس قلاش محکمے کو بینک بیلنس سے نوازا لیکن وہ ان کی شہزادگی کو دور نہ کرسکا۔

جب ضیاء آیا تھا تو ٹی وی پر ۲۰ کروڑ قرضہ تھا جو سالانہ ۷ کروڑ کے حساب سے بڑھتا جاتا تھا۔

جب ٹی وی چھوڑ کر گیا تو تمام قرضہ ادا ہو چکا تھا۔ اور ۲۰ کروڑ کی سالانہ آمدنی ہو رہی تھی۔

اور کارکن کو سال مین تین تین بونس مل رہے تھے۔

ٹیلی ویژن نے ادیبوں کو کبھی رائٹر نہیں سمجھا۔ انہیں صرف استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح پلکوں کو جاذب نظر بنانے کے لے حسینا ئیں لوشن استعمال کرتی ہیں۔ پروڈیوسر اپنے رائٹر خود بناتے ہیں۔ اپنے بنائے ہوئے اور بنے بنائے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انہیں گھڑے سے دلچسپی ہے گھوڑے سوار سے نہیں۔ جب ضیاء ام ڈی ایم ڈی ایک ایڈمنسٹریٹر ہے۔ شاعر نہیں۔ گلہ شکوہ بے کار ہے کیونکہ اس نے ضیاء جالندھری کو بھی ہینگر پر ٹانگ کر سٹور روم میں رکھوا دیا تھا۔

صاحبو ضیاء کی کہانی بہت سادہ اور مختصر ہے۔

سیک سخت گیر باپ نے ضیاء کے بچپن اور جوانی کو تلخ بنا دیا محبت سے محرومی بہت بڑی اذیت ہے۔ اگرچہ ضیاء کی نانی نے بھرپور محبت دی۔ لیکن ماں باپ کی محبت اور چیز ہے باپ کی سخت گیری کی وجہ سے وہ مالی مشکلات سے گھرا رہا باپ ریلوے میں ملازم تھے۔ وہ کیوں سخت گیر تھے یہ بھید نہیں کھلتا۔

نفسیات کے ماہر ہیں جن کا تعلق حرکت کے پروفیشنل سے ہے وہ سخت گیر نہیں ہوتے۔ رسمی اخلاق کے پابند نہیں ہوتے۔ دل اور ہاتھ کے کھلے ہوتے ہیں۔ کھاؤ پیو اور جیو کے قائل ہوتے ہیں۔

مثلاً ایر لائنز کے لوگ خصوصاً پائیلٹ۔ ریلوے کے لوگ خصوصاً گارڈ۔ بس چلانے والے۔ ٹرک ڈرائیور۔ تانگابان۔ ان سب کو حرکت سے تعلق ہے۔

میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ تقسیم سے پہلے ریلوے گارڈ اپنے ریسٹ جنکشن کو سرکاری تار دیا کرتے تھے کہ میرے لئے دوڈنر ایک لڑکی اور ڈبل بیڈ کا انتظام رکھو میں آ رہا ہوں اور اسے کوئی برا نہیں مانتا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ضیاء کے والد ریلوے کے متحرک سٹاف میں ہوتے ہوئے اس قدر صراط مستقیم اور سخت گیر کیوں تھے۔

شاید کے والد ایک آلہ کار تھے اور قدرت شاعر کی تخلیق کے لئے ضیاء کو درد کی دھنکی سے رواں دواں کر رہی تھی۔ فنکار ایسے ہی نہیں بن جاتے۔ بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ سونا بننے سے پہلے کٹھالی سے گزرنا پرتا ہے۔

شاعرانہ تکمیل کے لئے ضیاء کو ایک طویل عشق سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک انوکھا عشق تھا۔ کھچڑی عشق۔ چونکہ ضیاء بنیادی طور پر محبوب طبیعت کا مالک ہے اس عشق میں ایک ہی فرد ہے بیک وقت عاشق بھی تھا اور محبوب بھی۔

کاش کہ میں آپ کو اس کھچڑی عشق کے کوائف سنا سکتا۔ بہر حال چونکہ شاعر کی تکمیل کے لئے تھا اس لئے ملاپ خارج از امکان

تھا۔ مقصد ضیاء کو درد کی دولت سے نوازنا تھا۔

درد اللہ کی بہت بڑی دین ہے۔ درد ہو تو شاعر نہ ہو ادیب نہ ہو انسان نہ ہو کچھ بھی نہ ہو۔

پھر ضیاء کی شادی ہوگئی۔ یہ شادی انوکھی شادی تھی۔ گرم محبت اور کولڈ وار کا میدان گرم ہوگیا۔

محترمہ پشاور کی درسگاہ میں اپنے جھنڈے گاڑ چکی تھی۔ ایم اے انگلش تھی۔ خدوخال سے آراستہ تھی۔ سوشل تھی۔ گٹس والی تھی۔ بات کرنا جانتی تھی۔ تعلیم میں' کھیلوں میں' تقریبات میں' تنظیمات میں' اپنا لوہا منوا چکی تھی ڈی بیٹ (Debate) میں ڈکلے میشن (Declamation) میں ڈرامہ میں امتیاز حاصل کر چکی تھی۔ ادھر خوش شکلی تھی خوش گفتاری تھی شاعری تھی شہرت تھی۔ سول سروس تھی۔ محترمہ کو اپنی اچیومنٹس پر مان تھا ضیاء کو اپنی شخصیت پر ناز تھا۔ دونوں کیل کانٹے سے لیس تھے۔ دونوں نے خود کو منانے کا عزم کر لیا۔ میدان کارزار گرم ہوگیا۔ شکر ہے بچہ آگیا۔ اس نے دونوں کو سمجھا بجھا کر سیز فائر کروا دیا۔

صاحبو دعا کرو کہ میاں بیوی دونوں برابر کے گٹفڈ نہ ہوں ورنہ مشکل پڑ جاتی ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک میں حوالگی' سپردگی کا جذبہ ضرور موجود ہو۔ ورنہ ازدواجی بیلی چلتی نہیں ٹھس ہو کر رہ جاتی ہے۔

◆◆◆

نقوش

(محمد طفیل)

محمد طفیل کی کہانی ابوالحسن سوتے جاگتے سے ملتی جلتی ہے۔

بہت پرانی بات ہے۔ انارکلی کے پہلو میں ایبک روڈ ہوا کرتی تھی۔ اس سڑک پر ایک دکان تھی۔ اوپر فروغ اردو کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دکان خالم خولی تھی۔ نہ وہاں فروغ تھا نہ اردو نہ کچھ اور۔ بیچ میں ایک میز پڑا تھا جس پر کاغذوں کا ایک گردآلود گٹھا پڑا ہوتا۔ سامنے کرسی پر ایک گردآلود شخص بیٹھا ہوتا۔ چپ چاپ بے حس و حرکت جیسے کھویا ہوا ہو۔ میں جب بھی ادھر سے گزرتا حیران ہوتا۔ یا اللہ یہ کیسی مخلوق ہے۔

ان دنوں ایک شاعر میرا دوست تھا۔ وہ مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ اس کے مجھ پر بڑے احسانات تھے۔ اس کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ میری ہر بات میں 'ہاں میں ہاں ملاؤ۔ میرے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا چونکہ میں پیدائشی جی حضوریہ ہوں۔ میں نے اپنے شاعر دوست سے پوچھا' یہ فروغ اردو کیا چیز ہے اور یہ جو نیم سویا نیم جاگا آدمی کرسی پر بیٹھا رہتا ہے' یہ کون سی مخلوق ہے۔

وہ بولا یہ فروغ اردو تو خودستائی ہے اور یہ شخص ایک کاتب ہے۔ ایک کوا مور کے پر لگانے کی سوچ میں کھویا ہوا ہے۔

میں نے جی ہاں تو کہہ دیا مگر بات میرے دل نہ لگی بلکہ کانٹے کی طرح چبھی۔ میں ذات کا مفتی ہوں۔ میرا آباء کاتب تھے وہ فتوے لکھتے تھے' لکھواتے نہیں تھے خود لکھتے تھے۔ ان میں ایک کا نام احمد تھا۔ شاہ نے حکم دیا کہ فتویٰ لکھ کر لانا۔ احمد بھول گیا۔

اگلے روز دربار میں اسے یاد آیا۔ شاہ اس وقت کسی اہلکار سے باتوں میں مصروف تھا۔ احمد نے اپنے قلم دان بردار کو کہا کہ میرے پیچھے کھڑے ہو جاؤ اور اس نے کاغذ اپنی پیٹھ پر رکھ کر الٹے ہاتھ سے فتویٰ لکھ دیا۔ اتفاقاً شاہ کی نظر پڑ گئی۔ اس نے احمد کو راست قلم کا لقب عطا فرمایا۔ احمد راست قلم کی لکھی ہوئی کتاب آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہمارے آباء خوش نویس تھے۔ لہٰذا شاعر دوست کی بات میرے دل نہ لگی' الٹا میرے دل میں طفیل کی عزت پیدا ہوگئی۔

ایک روز میں طفیل سے جا ملا۔

اسے مل کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔

اس کا ہاتھ بے جان تھا' ٹھنڈا' سوکھا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ صرف ہونٹوں پر ایک بے بسی بھری کھسیانی مسکراہٹ تھی۔ اس کے پاس یہی مسکراہٹ کمیونی کیشن کا واحد ذریعہ تھی۔ میں سمجھا یہ بھی میرے طرح احساس کمتری کا مارا ہوا ہے۔

پھر ایک حیرت انگیز واقعہ عمل میں آیا۔ ادبی دنیا میں طفیل کی ادارت میں ایک نیا پرچہ ''نقوش'' طلوع ہو گیا۔

''نقوش'' کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ کبھی طفیل کو دیکھتا کبھی نقوش کو۔ یہ کیسے ہوا' بھید نہ کھلا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ترقی پسندوں کا دور دورہ تھا۔ وہ اکڑی گردن' اونچی ناک لیے ہشکائے پھرتے تھے۔ آج جب بھی ترقی پسندی کی بات ہوتی ہے تو ناقد تحریک کی بات کرتے ہیں۔ ترقی پسندوں کی ان دنوں کی نفسیات کی بات نہیں کرتی۔

ان دنوں ترقی پسندوں پر تفاخر کا عالم طاری تھا۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ آج تک جو کچھ ہوا غلط ہوا۔ ہم راستہ دکھانے آئے ہیں۔ ان کی بات میں تحقیر کا رنگ تھا۔ انداز تشدد بھرا تھا۔ تحریر میں دھونس تھی۔ نقوش کو دیکھ کر انہوں نے آنکھ مار کر سرگوشی کی۔ بولے ''طفیل تو ڈمی ہے' بانس کا چھید بھرا لکڑا ہے' پھونک تو ہم مارتے ہیں۔ نغمہ ہم پیدا کرتے ہیں۔''

کئی ایک مہینے یہ سرگوشی چلتی رہی۔

ایک روز میں ''فروغ اردو'' کی ڈمی سے جا ملا۔ پوچھا ''بھائی میرے! یہ لوگ تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

وہ پھسپھسی مسکراہٹ سے بولا ''کیا کہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''کہتے ہیں کہ تم تو خالی نام ہو' نقوش تو ان کا عمل ہے۔''

اس کی پھسپھسی مسکراہٹ میں مزید بے بسی پیدا ہو گئی۔ بولا ''وہ بڑے لوگ ہیں وہ جو کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو بتاؤ کہ تم کیا کہتے ہو؟''

بولا ''میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ آپ بتائیں آپ کیا کہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو یہ جانتا ہوں کہ کہنے والے اور ہوتے ہیں کرنے والے اور۔ مجھے لگتا ہے جیسے تم کرنے والے ہو۔''

وہ ٹوٹ بھری مسکراہٹ سے بولا۔ ''میں تو کچھ بھی نہیں۔''

اس روز سے میرے دل میں طفیل کے لیے ایک جگہ بن گئی۔ پھر ہم بار بار ملے لیکن وہ جگہ جگہ ہی رہی۔ دوستی نہ بنی۔

طفیل کا کوئی دوست نہ تھا کیونکہ اس میں کمیونی کیشن کی صلاحیت نہ تھی صرف ایک پھسپھسی بے بسی بھری مسکراہٹ جو واحد

ذریعہ اظہار تھی۔

پھر ہم بار بار ملے۔ پتہ چلا کہ وہ ازلی گونگا ہے' اکیلا ہے۔ انڈر گراؤنڈ یہ ہے۔ سطح پر سکون ہی سکون ہے اندر لاوا آتش فشانی کے لیے بے تاب ہے۔

ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں طفیل کو تو اپنا نہ سکا نقوش کو اپنا لیا' اپنائے رکھا۔

پھر طفیل ایک روڈ سے نقوش پریس میں آبیٹھا۔ لیکن منظر وہی ایک روڈ سا رہا۔ البتہ گرد آلودگی کچھ اور بڑھ گئی۔ کاغذوں کے گٹھے کے ڈھیر بڑے ہو گئے۔ بے بسی بھری مسکراہٹ کے ساتھ آنکھ غنڈی ہو گئی۔

پھر میں نے نقوش کے عروج کا دن دیکھا۔

اس روز میں اتفاق سے وہاں جا پہنچا۔ دیکھا کہ طفیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ مسرت بھری مسکراہٹ اور اس کی غنڈی آنکھ میں تفاخر ہے۔

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

بولا ''ابھی کیا کیا دیکھو گے؟''

اس روز وہ کہنے کے موڈ میں تھا۔ بولا ''یہ سب چمتکار اس مسودے کا ہے جو میرے سامنے میز پر دھرا ہے۔ کسی خاتون کا افسانہ ہے۔ میرے ایک پرانے کرم فرمانے بھیجا ہے کہ اسے ''نقوش'' میں چھاپ دوں۔''

میں نے عرض کیا۔ ''عالی جاہ! آپ کا اپنا پرچہ چوٹی کے پرچوں میں شمار ہوتا ہے' اس میں کیوں نہیں چھاپتے؟''

وہ بولے۔ ''خاتون ضد کرتی ہے' کہتی ہے جب تک میرا افسانہ ''نقوش'' میں نہیں چھپے گا' مجھے یقین نہیں آئے گا کہ میں افسانہ نویس ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا کرو گے' چھاپو گے یا نہیں؟''

بولا ''اگر نہ چھاپوں تو ان کا باہر کا غصہ گر جے گا۔ چھاپ دوں تو ان کے اندر گھاؤ لگ جائے گا۔''

پھر نقوش کے نمبر آنے لگے۔ نمبر پہ نمبر' نمبر پہ نمبر

اس بانس کے ٹکڑے میں پھونک بھر کر نغمہ پیدا کرنے کے دعویدار بغلیں جھانکنے لگے۔

شخصیت کے حوالے سے وہ بڑ کے درخت کے مصداق تھا۔ اوپر سے بھدا' سپاٹ' بوجھل۔ اندر دودھ بھرا اس درخت کی شاخیں

ہی شاخیں تھیں۔صلاحیتوں کی شاخیں۔وہ بہت پر عزم محقق تھا۔Planner تھا' Executer تھا' ایڈیٹر تھا۔مزاج کا محنتی نہیں بلکہ مشقتی تھا۔مشقت اس کے بند بند میں رچی ہوئی تھی۔اوپر سے جھیل کے پانی کی طرح پرسکون۔اندر طوفانی لاوا کھول رہا تھا۔ ارادہ اور عزم دونوں لفظ پھسپھسے ہیں۔اس میں ہٹ تھی۔تریاہٹ میں کر کے دکھا دوں گی۔

بولتا نہیں تھا' اعلان نہیں کرتا تھا۔دریائے سندھ کی طرح نیچے نیچے بڑھتا۔بڑھتا چلا جاتا حتیٰ کہ شہر غرق کر کے ڈوب جاتا۔

عورت کے بارے میں وہ میری طرح کمینہ تھا۔جس کی طرف متوجہ ہوتا اسے کہتا سب کھڑکیاں دروازے بند کر دو صرف ایک دریچہ کھلا رکھو جو میری طرف کھلتا ہے۔

وہ نقاب کے ابھرے ہوئے تار گنتا تھا۔Sense of Possession کا مارا ہوا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ صرف مجھ پر ہی ملکیت کی دیوانگی مسلط ہے۔لیکن وہ مجھ سے بازی لے گیا۔

اس کی محبوبائیں اس کی معترف تھیں لیکن بیچاری زچ ہو جاتی تھیں۔

اپنے محلے داروں کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے طفیل نے شکیلہ سے کہا تھا۔''یہ سب لوگ مجھے صورتاً جانتے ہیں' کسی کو معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔''

اس حوالے سے میں بھی طفیل کا محلے دار تھا۔غالباً ہم سب اس کے محلے دار تھے۔بیسیوں ملاقاتوں کے باوجود میں اسے صورتاً جانتا تھا۔اس کی شخصیت میں جھانکنے کا موقع مجھے اس کی تحریروں آپ' جناب' صاحب اور محترم نے دیا۔میں نے طفیل کو اس کی تحریروں کے آئینے میں دیکھا۔غالباً طفیل وہ پدمنی تھا جسے آئینے کی مدد کے بغیر نہ دیکھا جا سکتا تھا۔

تحریروں کے آئینے میں دیکھا تو پتہ چلا کہ طفیل گونگا پہلوان ہے۔طریق واردات کے حوالے سے دیکھیں تو یوں کہنا پڑے گا کہ طفیل گونگی پہلوان تھا۔

اگر وہ گونگا پہلوان ہوتا تو الجھاؤ پیدا نہ ہوتا۔فطرت نے طفیل میں نسائیت کی گلی ٹانک کر بات الجھا دی تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ شخصیت میں اسرار پیدا ہوا۔عزم میں تریاہٹ کی آمیزش ہو گئی۔نقوش کے ماتھے پر بندی لگی اور آنکھ میں سرمے کی دھار۔وہ پبلشر سے مدیر' مدیر سے تخلیق کار بن گیا۔تحریر میں آگ نے پھول' انگاروں کی شکل اختیار کر لی۔یہ سب کچھ تو خوب ہوا۔لیکن طفیل بذات خود ایک المیہ بن کر رہ گیا۔

جب اس مسکین صورت ادھوری مسکراہٹ کے ''میں تو کچھ بھی نہیں'' نے خاکہ نگاری شروع کی تو ادیب چونکے ارے یہ کیسے ہوا؟

ان خاکوں میں تلخی نہ تھی۔شدت نہ تھی۔طنز نہ تھی۔ ہلکے پھلکے لطیف اشارے' چٹکیاں جو گدگداتی تھیں۔ہنسی مذاق میں گہری باتیں۔لطافت میں ڈھکے چھپے طعنے۔ایسی باتیں جو ننگا کر دیتی تھیں۔لیکن چبھتی نہیں تھیں۔دیکھتے ہی دیکھتے اس نے خاکوں کے کئی ایک مجموعے شائع کر دیے۔

میں نے بھی خاکہ نگاری میں طفیل کی نقل مارنے کی کوشش کی لیکن وہ لطافت نہ پیدا کر سکا۔اشاروں میں بات کہہ نہ سکا۔

ایک روز گونگے کو زبان مل گئی' کہنے لگا۔

''کیا بڑوں کی طرح آپ نے بھی میرا راستہ روکنے کا عزم کر رکھا ہے۔

''کون سا راستہ؟''میں نے پوچھا۔

بولا''خاکہ نویسی کا۔''

میں نے کہا۔''تیرا راستہ اور ہے' میرا اور۔تو خاکہ لکھتا ہے میں خاکہ اڑاتا ہوں تو پتی پتی جوڑ کے پھول بناتا ہے۔میں پتی پتی اکھیڑ کے تحلیل نفسی کرتا ہوں۔''

میں نے کہا۔''تجھے تو میرا احسان مند ہونا چاہیے میں تو تیری برتری قائم کرنے کے لیے خاکہ لکھتا ہوں۔''

بولا''وہ کیسے؟''

میں نے کہا۔''میں اس لیے لکھتا ہوں تاکہ تیرے پھول اور میرے ٹنڈ منڈ کا فرق واضح ہو جائے۔''

بڑی دیر کے بعد طفیل کی حقیقت آشکار ہوئی۔پتہ چلا کہ وہ بے بسی بھری ادھوری مسکراہٹ والا دراصل الہ دین تھا۔اس کے پاس مٹی کا دیا تھا۔جب وہ دیا رگڑتا تو جن نمودار ہوتا۔یہ جن باہر سے نہیں بلکہ طفیل کے اندر سے نمودار ہوتا تھا۔''بول میرے آقا میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''تم میرے لیے وہ کر دکھاؤ جو کوئی اور نہیں کر پایا۔''

تریاہٹ کے طفیل بڑاAmbitious تھا۔کرنے کے لیے صرف وہ کام اٹھاتا جس میں چیلنج ہو۔باہر سے بے ڈھنگ بے حس نظر آتا تھا۔اندر سے بڑا حسن پرست تھا۔نسائی حسن' تخلیقی حسن' کتابت کا حسن' طباعت کا حسن' لے آؤٹ کا حسن۔ایک روز وہ مجھے اپنے گھر آم کھلانے کے لیے لے گیا۔ان دنوں وہ شاہو کی گڑھی میں رہتا تھا۔وہ پہلا دن تھا جب میں نے طفیل کی بیگم کو دیکھا۔ایک بڑا سا چوڑا سا چہرہ میرے روبرو تھا۔پرعزم' بارعب' جاذب نظر۔

مجھے ایسے لگا جیسے دونوں ہی تریاہٹ ہوں۔ پھر تصادم کے خیال نے مجھے بوکھلا دیا۔ آموں کی تمام ترشیرینی فکر میں ڈوب گئی۔ یا اللہ کسی باوقار خاتون کو تخلیق کار کی بیوی نہ بنانا۔ لیکن میری دعا کیا کرے گی۔ آج کل کی لڑکیاں تو تخلیق کار کو آئیڈیل بنائے بیٹھی ہیں۔ کتنا بڑا فریب نظر ہے۔ بیچاری! نہ ملے تو دکھی۔ مل جائے تو دکھی۔

جب طفیل رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری جنرل بنا تو اس کی شخصیت کا ایک اور پرت کھلا۔ وہ ایک ناظم بن کر سامنے آیا۔ اس نے گلڈ کی بوسیدہ چاپائی کو نظم ونسق کی مدھانی سے بلوہ کر رکھ دیا۔ اس کی اس کی خصوصیت کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کیونکہ عام طور پر تخلیق کار اس صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔

مینجمنٹ کے علاوہ اس میں کاروباری صلاحیت بھی تھی۔ آخر میں ''نقوش'' قرآن نمبر کی بارہ جلدیں شائع کر کے اس نے تہلکہ مچا دیا۔ اس حد تک کہ بات حکومت تک جا پہنچی اور طفیل کا رابطہ جنرل ضیاء الحق سے ہوگیا۔ ضیاء الحق مسلمان آدمی تھا۔ قرآن نمبر کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ آخری ایام میں میں نے طفیل سے پوچھا۔ ''یہ بتا' تیری کوئی ایسی خواہش بھی ہے جواب تک پوری نہ ہوئی؟''

بولا ''ہاں ایک ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کون سی؟''

کہنے لگا۔ ''نقوش کے خاص نمبروں کی اشاعت میں حکومت میری مدد کرے۔''

پھر اس کی شخصیت کے حیرت کدے نے ایک انوکھا پینترا مارا۔ اپنے میزبانوں کو بلائے بغیر' آواز دیئے بغیر' اطلاع دیئے بغیر' وہ چپ چاپ رخصت ہوگیا۔ صبح سویرے احسن نے مجھے فون کیا۔ گلوگیر آواز میں کہا۔ ''طفیل صاحب رخصت ہو گئے۔''

ان دنوں وہ اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ احسن کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح جب احسن چائے لے کر طفیل کے بیڈروم میں گیا تو دیکھا کہ طفیل کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

وہ ایک عظیم تخلیق کار تھا اور ایک عظیم تر شخصیت۔ اس نے شکیلہ سے سچ کہا تھا۔ ''لوگ مجھے صورتاً جانتے ہیں' کسی کو معلوم نہیں میں کون ہوں۔''

◆◆◆

ست رنگا

(ضمیر جعفری)

ضمیر کا خاکہ لکھنے کی آرزو بہت پرانی ہے کئے بار لکھنے بیٹھا۔قلم اٹھایا ہر بار رک گیا۔چل نہ سکا۔حیران ہوا۔سوچا ضمیر پر لکھنے میں ہچکچاہٹ کیوں۔مانا کہ چیز ٹیڑی ہے لیکن ایسی بھی کیا۔

پھر سوچتے ایک روز بھید کھل گیا۔پتہ چلا کہ ہچکچاہٹ اس لئے ہے کہ لاشعوری طور پر میں ضمیر کو بڑا سمجھتا ہوں مانا ہوں اور چونکہ ذات کا چھوٹا ہوں اس لئے بڑوں پر بات کرنے سے گھبراتا ہوں۔

صاحبو بڑے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔میں صرف علم ادبی بڑوں کی بات کروں گا ایک بڑے وہ ہوتے ہیں جو بڑے ہیں لیکن نہیں میں جانتے کہ وہ بڑے ہیں۔

ایسے بڑے موجود تو ہیں پر وہ اپنا پتہ نہیں دیتے' خود کو پتہ نہیں دیتے ہمیں کیا دیں گے۔سیانے کہتے ہیں مٹکی ادھ بھری ہو تو چھلچھلاتی ہے شور مچاتی ہے بھری ہو تو گھن ہو کر بیٹھی رہتی ہے۔دوسرے بڑے وہ ہیں جو سمجھتے ہین کہ وہ بڑے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ جانیں کہ وہ بڑے ہیں۔اس قسم کے بڑے دنیائے ادب وفن میں عام ملتے ہیں۔کراچی اور لاہور ایسے بڑوں سے بھرے پڑے ہیں ضمیر جعفری تیسری قسم کا بڑا ہے۔

تیسری قسم کے بڑے تذبذب کا شکار ہیں۔چکی کے دو پاٹوں تلے پس رہے ہیں۔ہوں' نہیں ہوں' ہوں نہیں ہوں۔ان کی کیفیت جلتی بجھتی تین سائیں جیسی ہے۔جل گئی تو ہوں۔بجھ گئی تو نہیں ہوں۔شک وشبہ کا آرا چلتا رہتا ہے۔

ضمیر جعفری اس بات کا محتاج ہے کہ کوئی اس کے گھر کی کنڈی بجائے اور کہے ضمیر جعفری آپ بڑے محتاج ہیں۔یہ خوش خبری سن کر ضمیر کا دل پشوری ہو جاتا ہے۔لیکن دو گھنٹے کے بعد پھر شک وشبہات آگھیرتے ہیں۔تین سائین بجھ جاتی ہے اندھیر گھپ ہو جاتا ہے۔صاحبو اب ایسا کون ہے جو ہر دو گھنٹے کے بعد ضمیر کے گھر کی کنڈی بجاتا جائے۔

ٹھہرئے ایک بات واضح کر دوں کہ ضمیر مزاحیہ کلام کی وجہ سے بڑا ہے شخصیت کی وجہ سے نہیں۔

آپ کہیں گے کہ میاں تو نا قد تو نہیں رورو کہانیاں کہنے والا ہے تجھے کیسے پتہ چلا کہ ضمیر کلام کی وجہ سے بڑا ہے۔

یہ بھی سن لیجئے۔ ہوا یوں کہ ریڈیو پاکستان نے مجھے حکم دیا کہ مزاحیہ پروگرام کرو۔ چار سال میں وہ پروگرام چلاتا رہا۔ یہ پروگرام معجون مرکب تھا جس میں اردو کے جانے پہچانے مزاح نگار شاعروں کی نگارشات پیش کی جاتی تھی۔

میں نے دیکھا کہ ضمیر کے کلام کہ سطر سطر بولتی ہے۔ بات ایسی لطافت سے قاری تک پہنچتی ہے کہ چھبتی نہیں۔ گدگداتی ہے فرحت کا احساس چھوڑ جاتی ہے۔

اس پروگرام میں مجھے پتہ چلا کہ ضمیر جعفری مزاحیہ شاعری میں بڑا ہے۔ بہت بڑا ہے۔

مزاحیہ شاعری کے راستے میں ایک سخت مقام آجاتا ہے بہت جلد انہیں احساس ہوجاتا ہے کہ ہمارے ہاں قاری اور سامع میں مزاح کی لطافت کا احساس بہت کم ہے۔ لیکن طنز پر واہ واہ ہوتی ہے لہٰذا وہ فن کو چھوڑ کر واہ واہ کی جانب چل پڑتے ہیں۔

مثلاً انور بڑے طمطراق سے آیا تھا خالص مزاح کا پٹارا ساتھ لایا تھا لیکن جلد ہی واہ واہ نے اپنا جادو جگایا اور وہ طنز کی جانب چل پڑا۔ اور اب دلدار بھٹی کی طرح ٹیلی ویژن کمپیئرنگ کے قبرستان میں دفن ہو چکا ہے۔

خدا مغفرت کرے خالص مزاح نگار تھا۔

محمود سرحدی میں مزاح کی بڑی حس تھی ہم امیدیں لگائے بیٹھے تھے لیکن اسے سیاست کھا گئی دلاور فگار لفظوں کے بھنور میں ڈوب گیا ضمی جعفری واحد مزاح نگار شاعر ہے جس نے طنز کی واہ واہ کو نظر انداز کر دیا۔ ضمیر طنز کرے بھی تو وہ اتنی لطیف ہوتی ہے ہی کہ چبھتی نہیں۔

لیکن ٹھہریئے یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں فن کے ایوان میں کیسے آگھسا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں۔ میرا موضوع تو شخصیت ہے۔

شخصیت پر بات کروں تو مختصر یہ ہے کہ ضمیر جعفری کا فن جس قدر لطیف ہے اس کی شخصیت اتنی ہی کثیف ہے۔

یوں سمجھ لیجئے کہ ضمیر کی شخصیت میں بھان متی نے کنبہ جوڑ رکھا ہے وہ چوں چوں کے مربے جیسی ہے۔ لیکن شاید آپ چوں چوں کے مربے سے واقف نہ ہوں۔ آپ نے حکم کے نسخے کا پڑا ضرور دیکھا ہوگا۔ اس میں بنفشہ ہوتا ہے عناب ہوتے ہیں ریشہ خطمی ہوتا ہے۔ استوخودوس ہوتا ہے۔ فل فل ہوتا ہے ابریشم ہوتا ہے پتہ نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔

ایسی ہی ضمیر میں ایک سید ھے ایک صوفی ہے ایک بزرگ ہے ایک پیرزادہ ہے ایک رند ہے ایک مے خوار ہے' ایک درویش ہے' ایک خسیس ہے ایک جی حضوریہ ہے ایک زن مرید ہے' ایک پنڈو ہے۔ ساتھ ہی ایک مسٹر بھی ہے۔ وہ مسٹر جس کے متعلق آپ فرماتے

ہیں کہ

پن کھلی ٹائی کھلی بکلس کھلے کالر کھلا
کھلتے کھلتے ڈیڑھ گھنٹے میں کہیں مسٹر کھلا

ضمیر کی شخصیت کے متعلق پورے طور پر وہ لوگ جانتے ہیں جو اس کے قریب رہتے ہیں۔

دوستو دعا کرو کہ ضمیر جعفری کے قریب رہنے کا کسی صاحب قلم کو موقع نہ ملے۔ جسے مل گیا سمجھ لو وہ پھانسی لگ گیا۔ پرانے زمانے مین ایک مثل مشہور تھی۔

کبڑے سے کسی نے پوچھا بتا تو کیا چاہتا ہے۔ تیرا کبڑا پن دور ہو جائے یا سب کبڑے ہو جائیں۔

کبڑا بولا کہ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ کبڑے ہو جائیں۔

صاحبو جان لو کہ ضمیر وہ کبڑا ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ سب لکھنے والوں کو مزاح کا عارضہ لاحق ہو جائے۔ جو صاحب قلم اس کے قریب جاتا ہے ضمیر اس کے دل میں یہ خوش فہمی پیدا کر دیتا ہے کہ ''تم میں مزاح کی بڑی صلاحیت ہے۔''

جناب والا میں نقاد تو نہیں ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مزاح ایک خودرو پودا ہے وہ اگایا نہیں جاتا گملے مین لگایا نہیں جا سکتا۔

صاحبو ہر نثر نگار کی تصنیف میں کہیں کہیں یہاں وہاں' مزاح پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر نثر نگار کو گمان پیدا ہو جائے کہ وہ مزاح نگار ہے اور اسے لازماً مزاح پیدا کرنا ہے تو وہ بیچارہ پھانسی لگ جاتا ہے۔

صاحب قلم کی سب سے بڑی مشکل جو ہے اس کا ہمیں احساس نہیں۔ یہ مشکل بالکل ایسی ہے جیسے آج کل کی نوجوان ماڈرن لڑکی کو درپیش ہے۔

آج کل کی ماڈرن لڑکی کو اپنی میک اپ اور ناز نخرے کے زور پر ایک خاوند کو پھنسا لینا تو آسان کام ہے لیکن پھر اسے زندگی بھر Keep کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست کی شادی ہو گئی میں اسے ملنے گیا میں نے حسب دستور اس سے پوچھا' میں نے کہا بتا کیسی بیوی ملی ہے تجھے۔

کہنے لگا یار میں تو مارا گیا۔

میں نے پوچھا کیا ہوا۔

بولا۔ میری بیوی اتنی حسین ہے کہ میں اسے ہاتھ لگاؤں تو وہ میلی ہو جاتی ہے

میں نے پوچھا۔ پھر بولا پھر کیا میں تو اس کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔

ایک سال کے بعد مجھے پھر اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا دیکھا کہ پڑوسن کو تاڑ رہا تھا۔

ہاں میں کہہ رہا تھا کہ شوہر پھنسا لینا کچھ مشکل نہیں لیکن پھر اسے زندگی بھر Keep کرنا۔ پھانسی لگ جانے کے مترادف ہے۔ یہی مشکل لکھنے والے کو ہے۔ ایک جاذب توجہ کتاب لکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ پھر اپنے معیار اور تاثر کو زندگی بھر قائم رکھنا پھانسی لگ جانے کے مترادف ہے۔

ضمیر نے کئی ایک صاحب قلم نثر نگاروں کو مزاح نگاری کی خوش فہمی دے کر انہیں پھانسی پر لٹکا دیا۔

جس طرح ضمیر کی شخصیت ست رنگی ہے ایسے ہی اس کا فم بھی ست رنگا ہے۔

ضمیر سنجیدہ کلام لکھتا ہے مزاحیہ کلام لکھتا ہے رزمیہ نظمیں دیکھو تو لگتا ہے جیسے بہت بڑا مجاہد ہو۔ ملی گیت دیکھو تو لگتا ہے جیسے پاکستان کے عشق میں گھل گھل کر پتہ نہیں کیا بن چکا ہو۔ صوفیائے۔۔۔ پنجاب کے کلام کا اردو میں ایسا ترجمہ کرتا ہے جیسے ابھی ابھی خرقہ ولایت وصول کر کے آیا ہو۔ گوروں کی لکھی ہوئی منظوم نظموں کا ترجمہ ایسے کرتا ہے کہ اصل شرما جائے۔ بہت پرانی بات ہے سردیوں کا موسم تھا ان دنوں موسم سرما مری پر ہو کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا۔ اتفاق سے مری کے ایک ہوٹل میں چند شعرا اکٹھے ہو گئے وہاں کسی نے کوک شاستری کلام چلا دیا۔ اس رات ضمیر جعفری نے کوک شاستری کلام کی وہ وہ باونڈریاں ماریں کہ پنڈت کوکا شرم سے پانی پانی ہو گئے کہ میں نے اپنے شاستری میں عظیم نسخہ جات کیوں نا درج کئے۔

اس روز مجھے پتہ چلا کہ ضمیر نے کہا بہت کچھ ہے چھپوایا بہت کم ہے۔

ضمیر کی شخصیت کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ایک آرام طلب فرد ہے۔ میری دانست میں وہ زندگی بھر عشق وشق کے جھنجھٹ میں نہیں پڑا۔ یہ شوق صرف صبر آزما ہی نہیں مشقت طلب بھی ہے۔ کون کھڑکیاں کھولے دیواریں پھلانگے۔ رت جگے کرے۔ وہ مشہور زمانہ شعر حضرت میر نے ضمیر پر لکھا تھا کہ

ہو گا کسی دیوار کے سائے تلے ضمیر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اس حوالے سے ضمیر کا وہ کوک شاستری کلام مشاہدتی نہیں تھا خالص الہامی تھا۔ میرا دوست اشفاق حسین ہومیو ڈاکٹر ایک روز سر پیٹتا ہوا میرے پاس آیا کہنے لگا مفتی ہم تو خالص الو کے پٹھے ہیں۔

میں نے کہا وہ کیسے۔

ہم نے ساری عمر غلط فہمی میں گزار دی۔

میں نے کہا ہوا کیا۔ کھل کر بات کر۔

کہنے لگا۔ آج میں نے ایک حقیقی دانشور کی زیارت کی ہے سبحان اللہ ہیٹس آف ٹو ہم۔

میں نے کہا ہوا کیا۔

میں نے کہا آج میرے مطب میں ایک مریض آیا۔ اس نے اپنے سمپٹمز بتائے۔

میں نے کہا گھبرائیے نہیں آپ کو کوئی بیماری نہیں صرف حرارت غریزی کی کمی ہے میں آپ کو ایک ٹانک لکھ کر دیتا ہوں۔

اس پر وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

کہنے لگا ڈاکٹر صاحب مجھے کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں آپ۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسی پڑیا نہیں جو میں اپنی بیوی کو کھلا دوں۔

لگتا ہے ضمیر ایسا ہی غیر مشقتی آرام طالب ہے۔ یہ بھی ہمارے لیے Blessing in Disguise ہے۔ ضمیر زعفرانی نثر بھی لکھتا ہے۔ سفر نامہ لکھتا ہے۔ خاکے لکھتا ہے۔ نثروں انداز میں لکھے جاتا ہے۔ اگر وہ دل لگا کر توجہ اور محنت سے نثر لکھتا تو ہم نثر نگاروں کے لئے مشکل پڑ جاتی۔ میرے ایک دوست نے مجھے ضمیر کا خاکہ لکھتے ہوئے کہنے لگا ہٹاؤ یار۔ میں تو ضمیر کو شاعر ہی نہیں مانتا۔

وہ کیسے میں نے حیرت سے پوچھا۔

کہنے لگا ضمیر میں شاعرانہ بات ہی نہیں۔

کیا مطلب؟ بولا۔ شاعر لوگ اپنا نام اچھالنے کی نسبت دوسرے اور ادیبوں میں کیڑے نکالنے کے زیادہ شوقین ہوتے ہیں۔ ضمیر نے آج تک کبھی دوسروں کی نندا نہیں کی۔ ضمیر کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ کوئی اسے گالی نہیں دیتا۔ نہ وہ ہاسٹلیٹی پالتا ہے نہ جزبیٹ کرتا ہے۔ البتہ اسے اپنا نام اچھالنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ بے شک ضمیر کو اپنا نام اچھالنے کا بہت شوق ہے لیکن اسے نام اچھالنے کا فن نہیں آتا۔ سمجھتا ہے کہ کام سے نام اچھلتا ہے۔ لکھے جاتا ہے لکھے جاتا ہے یوں اندھا دھند کام کے جاتا ہے جیسے کام کھل جا سم سم ہو۔

نام اچھالنے کا فن کسی کسی کو آتا ہے ہر کسی نے اپنا طریق واردات ایجاد کر رکھا ہے۔ منٹو بڑی محنت سے گالی کھاتا ہے۔

میں نے توجہ طلبی کے لئے عجز کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ ہمارے لاہور کے دو بڑوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا شغل اپنا رکھا تھا۔ مقصد عیب جوئی نہیں بلکہ توجہ طلبی ہے انہوں نے در پردہ آپس میں سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ ہم احمق ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ عداوت ہے۔ دراصل انہوں نے یہ بھید پالیا ہے کہ پراپے گنڈا کبھی منفی نہیں ہوتا۔ صاحبو سلف پروجیکشن بہت بڑا آرٹ ہے آپ نے اس خاتون کی کہانی سنی ہوگی جس نے اپنی نئی ہیرے کی انگوٹھی دکھانے کے لیے اپنے گھر کو آگ لگا دی تھی اور رو رو کر سارے محلے والوں کو کہتی تھی کہ سب کچھ جل گیا مگر یہ انگوٹھی رہ گئی ہے۔ سلف پروجیکشن کے لئے لوگوں نے بڑے منفرد طریقے ایجاد کئے۔ کرشن چند طبعاً بہت برا بیوروکریٹ تھا لیکن زندگی بھر غریب نواز کا ڈھونگ رچائے رکھا جوش نے تفاخر کو اپنائے رکھا۔

میرا جی نے بیراگی کا سوانگ بھرا۔

ضمیر بہر گھوما پھرا شخص ہے۔ وہ دنیا کے تمام ممالک میں گھوم پھر آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ضمیر سیاحت پسند ہے۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میری دانست میں یہ سیاحت پسندی نہیں بلکہ لذت آوارگی ہے۔ اس کی ساری زندگی لذت آوارگی می شاہد ہے پہلے کلرکی کی پھر جوج میں بھرتی ہوگیا فوج میں استعفیٰ دینے کے بعد ع گاؤں میں آ کر الیکشن لڑا سودا بازی کی اور پھر فوج میں پبلسٹی افسر بن گیا۔ فوج سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد سی ڈی اے میں پبلک ری لیشن افسر بن گیا پھر افغانستان کے ڈائریکٹوریٹ میں پبلسٹی افسر بن گیا وہاں سے فارغ ہوا تو اکادمی میں ایڈیٹر کی جاب سنبھال لی۔ یعنی ساری زندگی یہاں سے اڑا وہاں جا بیٹھا کی مصداق گزار دی۔ اگر کسی ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتا تو اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے پتہ نہیں کس عہدے پر پہنچتا۔

ملک ملک گھومنے پھرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گھر میں گھر والی کا راج ہے۔ وہاں پابندیوں میں۔ ضمیر کو جی حضور کا رول ادا کرنا پڑتا ہے لہٰذا آوارگی کے بغیر چارہ کار نہیں۔

ضمیر نے حال ہی میں اپنی کہانی قومی ڈائجسٹ میں شائع کی ہے۔ بڑے دلکش انداز میں اپنی طبعی لذت آوارگی کا اظہار کیا ہے۔

قدرت نے اس فنکار کو رولنگ سٹون کا رول اس لئے عطا کر دیا تا کہ پالش ہو جائے۔ اس کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو اور وہ MOOS اکٹھی نہ کر سکے۔ چونکہ MOOS فنکار کی دشمن ہے وہ زنگ آلود کر دیتی ہے۔

اسے آوارگی اس لئے بخشی گئی کہ اس کی حساسیت میں نت نئے چراغ روشن ہوں۔ صاحبو اللہ جسے چاہے عزت عطا کرے۔

◆◆◆

مدھم

(ڈاکٹر جمیل جالبی)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت کا جائزہ لینا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک ایسی خاتون کے مصداق ہیں جو زیورات سے لدھی پھندی ہے۔ فاخرہ لباس زیب تن کئے ہوئے ہے' فرانسیسی میک آپ سے بنی ٹھنی ہے۔ اس سج دھج تلے خاتون کی شخصیت دب گئی ہے' جب وہ گھر جائے گی فاخرہ لباس اتار کر گھریلو کپڑے پہن کر باورچی خانے میں بیٹھ کر آلو چھیلے گی اس وقت اس کی شخصیت ظاہر ہوگی۔

جمیل جالبی کی یہ بن ٹھن ان کی Achievements ہیں۔ اردو ادب میں ان کی Contribution ان کا کام ہے۔ ان کے کام کی دم مور کی طرح اتنی لمبی اور بھڑکیلی ہے کہ توجہ دم پر مرکوز ہو جاتی ہے اور شخصیت نظر انداز ہو جاتی ہے۔

جمیل جالبی نے بیسیوں ڈگریاں حاصل کیں' بیسیوں انعامات' اعزازات اور ایوارڈ حاصل کئے۔ پچاسوں کتابیں لکھیں' سینکڑوں مقالات لکھے پچاسوں اداریے تحریر کئے سینکڑوں تقاریر کیں' بحثوں اور ادبی سیمیناروں میں حصہ لیا۔ اتنا کام کیا کہ ان پر ایک سوانحی کتاب لکھنی لازم ہو گئی۔

آج کل سوانحی کتاب کا رواج ہو یا ہے یہ رواج مغرب سے آیا ہے۔ وہ کتاب ہوتی ہے جس میں کسی صاحب قلم کی زندگی اور کام کی تفصیل ہوتی ہے۔

کراچی یونیورسٹی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر محترمہ نسیم فاطمہ نے بڑی محنت اور کاوش سے جمیل جالبی کی سوانحی کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں صرف کام کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ صاحب کتاب پر Comments کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن محترمہ ڈاکٹر کے کام سے اس قدر متاثر ہو جاتی ہے کہ جگہ جگہ ان کی شخصیت پر لاؤڈ انداز میں بات کر دیتی ہے مثلاً ایک جگہ لکھتی ہیں:

''میدان ادب میں ڈاکٹر صاحب ایک بہادر جرنیل کی طرح پوری استقامت سے قدمی کرتے ہیں اور جب فتح کا پھریرا لہراتے ہوئے آتے ہیں تو حلقہ ادب میں نعرہ تحسین بلند ہو جاتا ہے۔''

گزشتہ چار ایک سال سے ڈاکٹر جمیل جالبی اسلام آباد میں مقتدرہ کے صدر نشین ہیں۔ وہ یہاں کی ہر ادبی محفل میں موجود ہوتے ہیں' کبھی کرسی صدارت پر کبھی مہمان خصوصی اور کبھی سامع کی حیثیت سے ان کی شمولیت کچھ اس انداز کی ہوتی ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ ہیں یا نہیں ہیں۔ صدارت کی کرسی پر بھی کبھی صدر بن کر نہیں بیٹھتے۔ لگتا ہے جیسے سامع ہوں۔

ادبی میدان میں مور بن کر نہیں آتے' لگتا ہے جیسے کبوتر ہوں۔ ایسا کبوتر جو غوں غوں نہیں کرتا' چھاتی پھلا کر نہیں چلتا۔ کئی ایک محفلوں میں وہ مقالہ بھی پیش کرتے ہیں۔ مدھم آواز میں اور محتاط اور متوازن الفاظ میں۔ بات کر کے اپنی جھکی جھکی گردن سے اپنی نشست پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کچھ کہہ گئے ہیں۔

میری طرح سامعین کو چونکاتے نہیں' ڈگڈگی نہیں بجاتے کہ دیکھو' یہ میں ہوں' میری طرف دیکھو' میری بات سنو' کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ روسٹرم پر خم ٹھونک کر کھڑے نہیں ہوتے کہ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔

پتہ نہیں محترم فاطمہ کس جمیل جالبی کا ذکر کر رہی ہیں جو جرنیل کی طرح میدان ادب میں داخل ہوتا ہے اور جھنڈا لہراتا ہوا بولتا ہے۔ غالباً محترمہ ڈاکٹر کی Achievements کی مداح ہیں اور جوش میں آ کر یہ بھول جاتی ہیں کہ ان کی مضمون آرائی ڈاکٹر کی شخصیت کو مسخ کر رہی ہے۔ صرف فاطمہ ہی نہیں جمیل جالبی کے کام کے کئی ایک مداح ہیں۔ میں بھی جمیل جالبی کی مداح ہوں۔ اس لئے نہیں کہ انہوں نے اتنے سارے کام کئے ہیں' تنقید و تحقیق کے جھنڈے گاڑ دئے ہیں' بلکہ اس لئے کہ وہ مور کی دم نہ جھلاتے ہیں نہ اسے ساتھ لئے پھرتے ہیں اور اس لئے کہ وہ گردن لٹکا کر چلتے ہیں' مدھم آواز میں بات کرتے ہیں۔ آتے ہیں تو پتہ نہیں چلتا کہ آ گئے ہیں۔ جاتے ہیں تو پتہ نہیں چلتا کہ وہ چلے گئے ہیں۔

صوفیا کہتے ہیں جو جینا چاہتے ہو تو ایسے جو کہ کسی کو پتہ نہ چل کہ ہو یا نہیں ہو۔ کسی کو احساس نہ وہ کب ائے اور کب چلے گئے۔ ہندوؤں کے گرو گورکھ ناتھ کہتے ہیں۔

بھڑک کہ نہ بولیوا

ٹھبک کینہ چالیوا

دھیرے دھریوا پاؤں

مطلب ہے کہ:

بڑ بڑ کر کے نہ بولو

کھڑکھڑ کرکے نہ چلو

اس دھرتی پر دھیرے سے پاؤں دھرو

لیکن محترمہ نسیم فاطمہ تو وار کر گئیں۔ ٹھریے یہ بات وضاحت طلب ہے۔ پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے لیکن ایسے ہوتا ہے عام طور پر اپنی شخصیت کے متعلق جو تصویر ہم اپنے ذہن میں بناتے ہیں وہ لوگوں کے تعریفی جملوں سے اخذ کی گئی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر مجھے اچھی طرح علم ہے کہ میں تصوف کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا اور عملی طور پر صوفی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کچھ لوگ تفریحاً یا خوش فہمی میں کہہ دیتے ہیں کہ مفتی تو صوفی ہے۔ ''نہیں! میں صوفی نہیں ہوں۔'' میرا ذہن چیختا ہے۔ ''یہ لوگ مجھے خواہ مخواہ تصوف کی مسند پر بیٹھا رہے ہیں۔'' پھر بیٹھے بیٹھائے میرے اندر کی ''میں'' سرگوشی کرتی ہے ''شاید ہوں'' ''نہیں ہوں!'' میرا ذہن چلاتا ہے۔ ''نہیں ہوں'' پھر انجانے میں اندر ایک جھگڑا اچل پڑتا ہے۔ ہوں' نہیں ہوں' ہوں نہیں ہوں۔ دیر تک جھگڑا چلتا رہتا ہے۔ آخر ذہن ہار جاتا ہے۔ خیال آتا ہے کہ یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں تو سچ ہی کہتے ہوں گے۔ چلو مسند رصوف پر بیٹھ ہی جاؤ۔ کیا حرج ہے اور میں سچے دل سے صوفی بن جاتا ہوں۔

گاؤں کی رانڈ گوریاں کہتی ہیں ہم تو رنڈاپا کاٹ ہی لیں لیکن یہ جو آنکھوں پر بٹھانے والے ہیں یہ کاٹنے نہیں دیتے۔ اگر محترمہ نسیم فاطمہ کی بات سن کر جمیل جالبی ذہنی کشمکش میں پڑ جائیں کہ جرنیل بنوں یا نہ بنوں تو مشکل پڑ گئی نا۔ صرف نسیم فاطمہ ہی نہیں جمیل جالبی کے تو سینکڑوں مداح ہیں ان کی باتیں سن کر پتہ نہیں جمیل جالبی کی گردن کیوں نہیں اکڑتی' چھاتی نہیں پھولتی' آنکھ میں چمک نہیں لہراتی۔ جمیل جالبی کی سوانح کتاب کے سرورق پر جو تصویر چھپی ہوئی ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی کا عمل ہے۔ اسے دیکھ کے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے کارناموں کا کتا میں تزکرہ ہے۔ تصویر پر تفاخر کے بجائے بے بسی کا عالم طاری ہے۔ سیانے کہتے ہیں شخصیت کا پروفیشن اور پروفیشن کا شخصیت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ جو لوگ عقیلہ اور سنجیدہ کاموں کو اختیار کر لیتے ہیں وہ منجمد ہو جاتے ہیں۔ شخصیت سنجیدگی کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ اصول اور قانون کی بیڑیاں پڑ جاتی ہیں۔ اخلاق کا ہیڈ کانسٹیبل ڈنڈا اٹھائے سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جن کے پروفیشن کا زندگی کے تفنی پہلو سے تعلق ہوتا ہے ان میں قیام نہیں بلکہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بندھے ٹکے اصولوں کو نہیں مانتے۔ الٹا جذبات کی پھوار چلتی رہتی ہے۔

شوبز والے زندگی کو فن فیئر سمجھتے ہیں۔ حرکت سے تعلق رکھنے والے خانہ دوش' گاڑی بان' ڈرائیور' پائلٹ یوں زندگی گزارتے ہیں جیسے پکنک پر آئے ہوں۔ حالات وہی رہتے ہیں زاویہ نظر بدل جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی زندگی بھر تحقیق اور تنقید جیسے سنجیدہ کام میں مصرف کار رہے ہیں ان کی شخصیت پر لازماً اثر پڑنا چاہیے تھا کمر جھک جاتی پیشانی پر گھور بیٹھ جاتی ' سلوٹیں پڑ جاتیں انداز میں تلخی پیدا ہو جاتی۔ بلکہ میں تو کیوں گا کہ ماتھے پر دو سینگ نکل آنے چاہئیں تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا ان کے چہرے پر تفکر کا بوجھ نظر نہیں آتا تنقید کی دھار کی کاٹ دکھائی نہیں دیتی۔ اگر چہ بات بات پر ہنستے نہیں لیکن کبھی کبھی مسکرا دیتے ہیں اور مسکراہٹ مین دبی دبی طنز نہیں بلکہ معصومیت کا عنصر واضح ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی شخصیت کا جزو اعظم محبوبیت ہے۔

آباء سوات کے یوسف زئی تھے گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ ہندوستان میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اپنی شجاعت اور قابلیت کی وجہ سے رتبہ حاصل کیا' جاگیردار بن گئے۔ صرف جمیل کے آباء کی بات نہیں شمالی علاقوں کے بہت سے خان طالع آزمائی کے لئے ہندوستان گئے' اپنی شجاعت اور قابلیت کی بنا پر رتبہ حاصل کیا جاگیردار بنے پھر وہیں مقیم ہو گئے اور اپنے لیڈرانہ اوصاف کی وجہ سے علاقے میں اثر و رسوخ حاصل کیا۔

جمیل کے والد سہارنپور کے زمیندار تھے۔ جمیل پلوٹھی کا بیٹا تھا اس لئے لاڈلا تھا۔ بچپن میں وہ کچھ عرصہ نانی کے پاس رہا۔ نانی کا لاڈ پیار ماں سے دو چند ہوتا ہے۔ لہٰذا نانی نے جی بھر کے بگاڑا۔ والدہ پرانے خیالات کی تھیں۔ ممتا سے چھلکتی تھیں۔ بجلی چمکتی تو جمیل کو بغل میں چھپا لیتیں' ''گرج چمک پلیٹھی کے لڑکے کی بیرن ہوتی ہے۔'' کل دس بہن بھائی تھے۔ ماں کہتی ''بیٹا اکٹھے ایک جگہ نہ بیٹھو نظر لگ جائے گی۔

آج جب تمام بھائی بہن اپنے اپنے گھر میں آباد ہیں اور خود اولاد والے ہیں۔ آج بھی والدہ کا وہی رویہ ہے۔ سب اکٹھے بیٹھیں تو ٹوکتی ہیں نہ نہ نظر لگ جائے گی۔

جمیل نے عنفوان شباب میں قدم رکھا تو نظر لگنے کے تمام عوامل موجود تھے' خدوخال ستوان تھے' رنگ گورا تھا' قدوقامت موزوں تھا' مزاج شرمیلا تھا' میرٹھ کالج میں داخل ہوا تو وہاں ماحول حسن پرستی سے بھرا ہوا تھا۔ اساتذہ کا محبوب اس لئے بنا کہ پڑھنے کا شوق تھا' ادبی شوق والدہ سے ملا۔ وہ خود شعر کہتی تھیں۔ جمیل بچپن ہی سے کتابوں سے کھیلا کرتا تھا' یوں جیسے لڑکیاں گڈیوں سے کھیلتی ہیں۔ کاپیوں کے صفحے پھاڑ کر چھوٹی چھوٹی کتابیں بنا لیتا۔ والد یوسف زئی تھا' پریکٹیکل تھا محنتی تھا انتظامی تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹا ادیب بنے۔ کہتا تھا اس دنیا میں خواب دیکھنے والوں کی ضرورت نہیں۔ کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے والد نے جمیل کے لیے سائنسی مضامین کا چناؤ کیا تھا۔ دو ایک مہینے تو جمیل نے سائنس سے نباہ کیا پھر گھر والوں کو بتائے بغیر آرٹس سے بدل لئے۔

جمیل میں دو شوق نمایاں تھے ایک تو Languages کا شوق دوسرے امتحان پاس کرنے کا جنون۔ انہیں دنوں قائداعظم کی تقریر سن کر پاکستان کا جنون سر پر سوار ہوگیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اس جنون کے تحت گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر گاڑی میں سوار ہو کر پاکستان آ پہنچا۔ تین چار مہینے جیکب لائن کے برآمدے میں پڑا رہا۔ ادھر گھر والے ماہی بے آب تڑپتے رہے۔ ادھر یہ بے سرو سامانی میں آوارہ رہا۔ پھر ریڈیو اعلان سے خبر والدین تک پہنچی۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور چھوٹے بیٹے کے ہاتھ سوٹ کیس بھر رقم بھیج دی۔ جس سے جمیل جالبی نے پیر الٰہی بخش کالونی میں ایک مکان خرید لیا۔ گزارے کی صورت پیدا ہوگئی۔

گزارے اور رہائش کا بندوبست ہوگیا تو جمیل کی توجہ پھر سے تعلیم اور ڈگریوں کے حصول کی طرف مبذول ہوگئی۔ یوں دھڑا دھڑ ڈگریاں حاصل کرتا رہا جیسے بچے لالی پاپ چوستے ہیں۔ پتہ نہیں کون کون سی اناپ شناپ ڈگریاں حاصل کیں۔ جہاں بھی امتحان نظر آیا اسے ایڑی مار کر پچھاڑ دیا۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے سی ایس ایس CSS بھی کر لیا۔ چناؤ میں آ گیا انکم ٹیکس میں تعیناتی ہوگئی۔ دیر تک انکم ٹیکس ملازمت کی لیکن سی ایس پی کے ڈھانچے میں ڈھل سکا۔ دس سال پہلے ہی ریٹائر ہوگیا۔ جناب پہلے چھپ چھپ کر ادبی کام کرتے تھے۔ اب کھل کر ادبی میدان میں آ گئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت کے چند ایسے پہلو ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اتنے سال تحقیق و تنقید جیسے بوجھل کام کرنے کے باوجود سر پر سینگ نہیں نکلے ماتھے پر تیوری نہیں بیٹھی میں تحقیق و تنقید کی عظمت کا اعتراف کرتا ہوں لیکن انہیں ادب نہیں بلکہ علم کے زمرے میں گنتا ہوں۔

سیانے کہتے ہیں کہ علم حد سے بڑھ جائے تو ماسٹر بنا دیتا ہے اور ماسٹرز میں اتنا تفاخر پیدا ہو جاتا ہے کہ Monters بن جاتے ہیں۔ عام طور پر اصول قانون کی پکی سڑک پر چلنے والے انسانی پگ ڈنڈی کو چھوڑ جاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ جمیل جالبی زندگی بھر چلتا رہا ہے اور پگ ڈنڈی کو بھی نہیں چھوڑا۔ اکثر جمیل جالبی کو چھیڑتا رہتا ہوں کہتا ہوں ڈاکٹر اقبال بہت بڑا مفکر تھا وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی اسے اتنا بھی چھوڑ دے۔

میں کہتا ہوں ڈاکٹر آپ تخلیق کی طرف بھی توجہ کریں اپنے memoirs لکھیں۔ جمیل میری بات غصہ نہیں کھاتا۔ چلو غصہ نہ سہی ایسی نظر سے ہی دیکھ لے "اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں" ایسی نظر سے بھی نہیں دیکھتا بس مسکرا دیتا ہے۔

صاحبو میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی شوہر کے منہ سے اپنی بیوی کی تعریف نہیں سنی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی بیوی کی تعریف میں

رطب اللسان ہے۔ کہتا ہے اگر میری بیوی قدم قدم پر میرا ساتھ دیتی' میری قدم قدم پر میرا ساتھ نہ دیتی میری ہمت نہ بندھاتی تو میں یہ مقام حاصل نہ کر پاتا۔ حیرت کی بات ہے۔

عام طور سے ہوتا یوں ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی منزل ہے تو بیوی راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے ڈاکٹر کی بات سن کر میرے دل میں خیال آیا۔ ارے کیا ایسی محترمہ بھی ہوتی ہے جو شوہر کی منزل کو سوکن نہ سمجھے' الٹا قدم قدم پر شوہر کا ساتھ دے۔ دل میں اشتیاق جاگا کہ میں بھی زیارت کروں' محترمہ کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ سر سے پاؤں تک وقار ہی وقار تھا' ہونٹوں پر ہلکا سا رواداری بھرا تبسم بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وقار تو لیڈر شپ کا حامل ہوتا ہے اور لیڈر شپ کا مطلب ہے ''سردار مزاج'' اور سردار مزاج پیچھے پیچھے نہیں چلتے۔ یا اللہ تیرے بھید تو ہی جانے بیوی کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کو دیکھیں تو لگتا ہے جیسے کوئی ٹین ایجر گرل فرینڈ کی لگن میں سرشار ہو۔ محترمہ کو دیکھیں تو سودا کے شعر کی نفی ہو جاتی ہے۔

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

اگر چہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت کی لے مدہم ہے روانی تو ہے مگر مدھم میں' قطرہ قطرہ۔ جذبہ تو ہے لیکن اظہار مدھم میں ہلکا ہلکا۔ چال بلمپت میں ہے' آہستہ آہستہ۔ کوئی چیز حد پر نہیں۔ نہ اس حد پر نہ اس حد پر۔ سب مدھم میں ہیں لیکن لگتا ہے کوئی ڈھکی چھپی روک ہے۔ دبی دبی ہے مگر ہے جو روانی میں مخل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی میں اتنی احتیاط ہے جیسے دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پئے۔ پتہ نہیں۔ ڈاکٹر کس دودھ کا جلا ہے۔ شاید کوئی خوف ہے' دبا دبا خوف' جس نے بے نام شک وشبہ کو جنم دے رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے اظہار مسدھ سے بھی زیادہ مدہم پڑ گیا ہے۔ کاش ڈاکٹر میں کچھ اور روانی ہوتی۔ بریک اتنی طاقتور نہ ہوتی لیکن رکاوٹیں تو ہوتی ہیں' ہر شخصیت میں ہوتی ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کشش ثقل کی رکاوٹ نہ ہو تو بوٹے اگ نہ سکیں۔

◆◆◆

کھچڑیاں

(وحید قریشی)

ڈاکٹر وحید قریشی نئے نئے اسلام آباد تو میں نے ان کے ایک دوست سے پوچھا کہ یہ ڈاکٹر وحید قریشی کیا چیز ہے۔

وہ مسکرایا' کہنے لگا ''مفتی! ڈاکٹر وحید قریشی دیکھنے کی چیز نہیں برتنے کی چیز ہے۔''

میں نے کہا ''بھئی یہ بھی بتا دو کہ اسے کیسے برتتے ہیں۔''

بولا ''اسے ادبی محفلوں میں دور سے نہ دیکھو۔ پاس بٹھاؤ۔ گپ شپ کرو۔ سکنڈل سناؤ پھر دیکھو۔''

ذرا ڈاکٹر کی جانب دیکھئے۔ معززیت کا ایک ڈھیر لگا ہے۔ گھبرایئے نہیں یہ صرف باہر کی بات ہے اندر جھانکو تو ایک معصوم بچہ رنگین بنٹے کھیل رہا ہے۔ بات کرتے ہوئے سنو تو معقولیت ہی معقولیت تانتا بندھ جائے گا۔ اندر کان لگاؤ تو تانیں لگی ہیں۔ سولہ سال کی ایک دوشیزہ گنگنا رہی ہے۔ الھڑ جذبات کومل آواز مدھر گیت بے برجت سریں۔ ساتھ خالص لاہوری بھاما جھا سنگت کر رہا ہے دھن دہا گے تا گے۔

صاحبو ڈاکٹر وحید قریشی پانی سمان ہے۔ صراحی میں ڈالو تو صراحی بن جائے گا مٹی کے پیالے میں ڈال لو تو پیالہ بن جائے گا۔ اسلام آباد پنڈی کی علم ادبی محفلوں میں میں نے اسے مرصع صراحی بنے ہوئے بھی دیکھا ہے اور جام سفال بھی۔ پھر ڈاکٹر وحید قریشی کی نگاہ میں میں ایک ایسی چمک نہیں دیکھتا ہوں جس سے پتہ چلتا ہے کی وہ آنکھوں میں رنگ پچکاری چھپائے بیٹھا ہے۔ اب کوئی گوپی زبان کھولے تو راز کھلے۔

ایک ڈاکٹر وحید کی ہی بات نہیں۔ یونیورسٹیوں میں جتنے سینئر پروفیسر ہوتے ہیں سب پنگھٹ کے دولہے ہوتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ جنہیں ہر وقت پچاس ساٹھ نوجوان آنکھوں کے فوڑے رحسین واحترام کی پنکھیاں جھلاتے رہیں بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں رنگ پچکاریاں نہ ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو صدر بنا دو تو سولہ آنے صدر بن جائے گا۔ پہلے تولے گا پھر منہ سے بولے گا۔ حاضرین میں آخری بنچ پر بیٹھا دو تو

ہوٹ کرنے سے نہیں جھجکے گا۔ بحث میں لگا دو تو عالمانہ موشگافیاں نکالے گا یوں جیسے علم ہی اوڑھنا بچھونا ہو۔ چار یاری میں بیٹھا دو تو یوں باونڈریاں مارے گا کہ سوجھ بوجھ سے عاری ہو۔

ڈاکٹر جب نیا نیا اسلام آباد آیا تھا تو ہم ڈر گئے تھے۔ ڈر با تو تھا ہی جب اس جثے کا نقاد میدان میں اتر آئے تو میرے جیسے منشی لوگ دوڑ کر اپنے اپنے بلوں میں جا گھستے ہیں۔ لیکن یہ خوف کا علم چند ہی رہا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے آتے ہی ہم پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔ پنڈی اسلام آباد کے ادبی حلقوں کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ادبی محفلوں میں صدر کسے بنائے جائے۔ اس نے ئی مشکل مستقل طور پر حل کر دی پھر پریشان خٹک کی آمد پر مہمان خصوصی کا مسئلہ بھی احسن طور پر حل ہو گیا۔

پرانے زمانے میں ایک کہاوت تھی ان تینوں سے بچ کر رہیو کالے چھوٹے موٹے سے۔ آج کل اس کہاوت میں ترمیم ہو گئی ہے کہتے ہیں ان تینوں سے بچ کر رہیو عالم عاقل ناقد سے۔

عالم کے بارے میں سیانے کہتے ہیں Master are Monesters پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مگر ایسا ہوتا ہے کہ جوں جوں آپ عالم بنتے جاتے ہیں توں توں آپ کی میں میں پھنک بھرتی جاتی ہے۔ اول تو عالم اکٹھے بیٹھتے ہی نہیں۔ جہاں اکٹھے بیٹھیں میں میں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ دوسرا کرے تو عقل کا چھنکنا چھنکانے لگتے ہیں۔ ناقد اڈیٹر کی طرح ہوتے ہیں ان کی انگلی آپ ہی آپ غلطی پر جا رکتی ہے۔

پھر وہ بات:

"نکتہ چین ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے"

ہم عام بندیت تو اس ات کے خواہاں ہیں کہ کوئی غم دل سننے والا ہو۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ بھید پا لیا ہے کہ علم اور عقل بوقت ضرورت استعمال کرنیت کی چیزیں ہیں' خود پر طاری کرنے کی نہیں۔

ڈاکٹر علم اور عقل کو خود تر طاری نہیں ہونے دیا۔ طاری کر لیتا تو روان بن جاتا۔

علم اور عقل کو استعمال کر کے پھر پوٹلی میں بندھ کر الماری میں رکھ دیتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی بنیادی طور پر ایک کامی ہے۔ اتنی بوجھل ڈگری اتبا اونچا گریڈ اوت مسند نشین ڈزگنیشن کے باوجود ذات کا کامی ہے۔ وہ اردو قومی زبان کا ڈھنڈورا پیٹے جا رہا ہے پیٹے جا رہا ہے۔ یوں پیٹے جا رہا ہے جیسے سننے والے سن رہے ہوں۔ سننے والے نہیں سن رہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا مقصد خود سننا نہیں عوام کو سنانا ہے کہ انہیں تسلی رہے کہ کام ہو رہا ہے۔

تقسیم کے بعد مجید ملک کو لاہور اردو بورڈ کا ڈائریکٹر بنایا گیا تو میں نے کہا۔ ''لو بھئی اب تو موج ہو گئی۔'' کہنے لگا ''کیوں؟'' میں نے کہا ''اطمینان سے اردو نافذ کرو'' وہ ہنسا' بولا ''مفتی! '' تو نہیں سمجھے گا تو سیاست میں کورا ہے۔ یہ بورڈ اس لئے نہیں بنایا گیا کہ اردو نافذ کرے بلکہ اس لئے کہ اردو کے نفاذ میں التا پیدا کرے' لوگوں کو تسلی دے کہ کام ہو رہا ہے۔ مقصد کام کرنا نہیں تسلی دینا ہے۔''

سرکار بھی کیا شے ہے۔ کچھ محکمے اس لئے بناتی ہے کہ کام ہو اور کچھ اس لئے کہ کام ہوتا نظر آئے لیکن ہو نہیں۔ کچھ اہلکاروں کو چھوٹے گریڈوں سے کر ہاتھ میں ہنر پکڑا دیتی ہے کچھ لوگوں کو صدر نشیں بیٹھے ہیں۔ ایک اردو زبان کا دوسرا اردو اکادمی کا۔

صرف ڈاکٹر وحید قریشی ہی نہیں اب تو عوام بھی جانتے ہیں کہ سیاسی مصلحت کی وجہ سے اردو زبان ابھی تک پاکستان میں سرکاری طور پر رائج نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس وجہ سے کیا نتائج پیدا ہو رہے ہیں اس کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا۔ میں ان تمام اداروں کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں' جو نفاذ اردو کے لئے کام کر رہے ہیں اے صاحبو! مجھ پر ترس کھاؤ میں وہ بدقسمت فرد ہوں جس کی کوئی پہچان نہیں۔

میں انگریزی میں سوچتا ہوں۔ اردو لکھتا ہوں۔ پنجابی بولتا ہوں۔

میں پنجابی پڑھ نہیں سکتا۔ اردو بول نہیں سکتا۔ انگریزی لکھ نہیں سکتا۔

گھر میں پنجابی بولتا ہوں۔ میری بیٹیاں اردو بولتی ہیں۔ میرے پوتے انگریزی بولتے ہیں۔

سبحان اللہ کیا کھچڑی پک رہی ہے میرے گھر میں۔

کسی مسخرے نے میرے گھر کو تماشا بنا دیا ہے۔

بیٹیوں سے پوچھتا ہوں کہ بی بی تم اردو کیوں بولتی ہو۔ ہماری ماں بولی تو پنجابی ہے۔ وہ جواب دیتی ہیں۔ ابو ہر جگہ اردو بولی جا رہی ہے۔ سکولوں میں کالجوں میں' دفتروں میں بازاروں میں' محفلوں میں۔

پوتوں سے پوچھتا ہوں کہ میاں تم گھر مین انگریزی کیوں بولتے ہو۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمیں اے لیول پاس کر کے بڑا افسر بننا ہے۔ کیوں نہ بولیں انگیریزی۔

سچ کہتے ہی۔ انہیں میری طرح ساری عمر کلرکی کرنا منظور نہیں ہے۔

میرے پوتے دوڑے دوڑے میرے پاس آتے ہیں پوچھتے ہیں بابا۔ چوہتر کا کیا مطلب ہے۔ میں کہتا ہمقں سیونٹی فور وہ چوہتر کے معنی سمجھ کر خوش خوش چلے جاتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ جب وہ بڑے افسر بنیں گے تو کب چاہیں گے کہ اردو نافذ ہو جائے۔نافذ ہو گئی تو وہ کس سے پوچھیں گے کہ چوہتر کا کیا مطلب ہے۔وہ خوف زدہ ہیں کہ انہیں چوہتر کا مطلب اپنے پی اے ست پوچھنا نہ پڑے۔

یہ کالا صاحب' فرنگی بہادر کا تحفہ ہے۔جو برصغیر سے وداع ہوتے وقت اس نے ہمیں بخشا تھا۔

صاحبو! جب فرنگی بہادر رخصت ہوا تھا اس وقت لاہور میں صرف تین انگلش کے سکول تھے۔اب تین ہزار سے زائد ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے میں پوچھتا ہوں آپ کس امید پر کتابوں پر کتابیں لکھے جا رہے ہیں۔کیوں اپنی جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔اپنا تخلیقی کام تیاگ رکھا ہے۔اپنی راہ کھوٹی کر رکھی ہے۔

کالا صاحب بہت سیانا ہے۔کائیاں ہے۔اس نے اپنے تحفظ کے لئے قومی زبان کو سیاسی مسئلہ بنا دیا ہے۔نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔اور اب حکومتیں چاہے فوجی ہوں یا جمہوری اس مسئلے سے خوف زدہ ہیں۔بیچاری حکومتیں' مجھے ان پر ترس آتا ہے۔

آج کل اسلام آباد میں اردو کی ادبی محفلوں پر بہور آئی ہوئی ہے۔آئے دن فائیو سٹار ہوٹلوں میں محفلیں جمتی ہیں۔جن کی صدارت ڈاکٹر وحید قریشی کرتے ہیں اور بڑے بڑے وزیر مہمان خصوصی کی حیثیت سے ان محفلوں میں زینت افروز ہوتے ہیں اور بڑے خلوص اور جذبے سے اردو ادب سے اظہار عقیدت کرتے ہیں۔

اور میرے ادبی ساتھیو آپ' میں' ہم سب لکھ پر سہرے سجائے۔ڈائس پر کھڑے ہو کر بڑی ٹین سے اپنے اپنے مضامین پڑھتے ہیں۔آپ تالیاں بجاتے ہیں۔اس وقت میرے اندر سے ایک آواز ابھرتی ہے۔یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ہماری زبان تو سیکرٹیریٹ سے باہر دھتکاری ہوئی' پھٹکاری ہوئی' شرمندگی کی ماری منہ چھپائے کھڑی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی ساہمت اور حوصلہ میں نے بہت کم اشخاص میں دیکھا ہے۔ان کے گرد بہت سے حریفوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔لیکن ڈاکٹر نے حوصلہ نہیں ہارا۔وہ حریفوں سے چوکھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔

حریف ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

اونچا گریڈ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔

صدر نشینی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔

علم اور فضل دم دبائے بیٹھے ہیں۔

بڑھاپا اور اس کی جملہ بیماریاں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔

لائف سیونگ ڈرگز کا مسلسل استعمال ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔

روزمرہ کی ادبی محفلوں کی صدارات ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ الٹا انہوں نے صدارات میں بڑا نام پایا ہے۔ لوگ انہیں سولہ آنے صدر کہتے ہیں۔

اس لئے کہ ڈاکٹر وحید قریشی مین زندگی کے لئے بے پناہ "اودھ" ہے اور زندگی سے محفوظ ہونے کی بے پناہ صلاحیت ہے کہ فروگی رکاوٹیں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔

میں اکثر ڈاکٹر سے کہا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر چھوڑ اب نقد ونظر کو اب بہت ہولیا۔ کوئی تخلیقی کام بھی کر لے۔ جواب میں وہ ہنس کر کہتا ہے کہ وہ بھی حاضر ہے۔

ریچھوں کے ساتھی شیر اور ہاتھی
دفتر میں بیٹھے گپ کر رہے تھے
اور سوچتے تھے کہ محفوظ گھر ہے
اور گھر کے باہر فوجوں کے افسر
کرتے ہیں پل پل رتے مسلسل
بھوتوں کا جنگل جنگل میں منگل
منگل منائیں اور گیت گائیں
بستی کے لوگو بستی کے لوگو

◆◆◆

لوک ورثہ
(عکسی مفتی)

پتہ نہیں وہ کون دانشور تھا جس نے کہا تھا:

''اگر دو شخص اکٹھے ہیں مگر ان کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لے کوئی بات نہیں تو جان لو کہ وہ باپ اور بیٹا ہے۔اس قول نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا کی میں اپنے بیٹے کے ساتھ باپ کا تعلق نہیں پیدا کروں گا۔سادری شرارت جذبہ احترام کی ہے احترام کدو اشخاص کے درمیان دیوار بن جاتا ہے۔پتہ نہیں یہ حکم کس نے چلایا تھا کہ ماں باپ کا احترام کرو۔احترام کے جذبے نے ہمیں ایک دوسرے سے کاٹ کر رکھ دیا ہے۔بیٹے کو باپ سے'شاگرد کو استاد سے'مسلمانوں کو اللہ اور اللہ کے کلام پرآن سے'احترام کی وجہ سے ہم ے قرآن کو ریشمی جذدانوں میں بند کر کے رکھ دیا ہے اور ہم اللہ سے ڈرتے ہیں تھر تھر کانپتے ہیں۔ہم نے اسے دور آسمانوں پر بٹھا رکھا ہے۔ہم اس کے قرب سے خائف ہیں۔احترام اور ڈر کی وجہ سے آج کا بیٹا اپنے باپ کو''دی اولڈ مین'' کہتا ہے۔شاگرد استاد پر نکتہ چینی کرتا ہے۔

کاش کوئی راہبر کہتا کہ اللہ سے محبت کرو کوئی دانشور کہتا کہ باپ سے پیار کرو۔

۱۹۶۲ء میں میں نے علی پور کا ایلی عکسی کے نام ان الفاظ میں معنون کی تھی۔''اپنے بیٹے دوست اور ساتھی عکسی مفتی کے نام۔''

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم دوست تھے'ساتھی تھے۔جب مجھے علم نہ تھا کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب ہم اجنبی ہوں گے۔

چھبیس سال ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے زندگی کے راستے پت جوتے چٹخاتے پھرے۔رسمی قیود سے بے نیاز۔تکلف اور دکھلاوے سے آزاد۔لیکن آج۔۔۔۔آج ہم ایک دوسرے کے سامنے یوں کھڑے ہیں جیسے دو اجنبی ہوں۔ہماری شخصیتوں کے رنگ جدا جدا ہیں۔ہمارے خیالات مختلف ہیں۔ہمارے رخ متضاد ہیں۔

آج کے عکسی میں ایک مست قلندر ہے۔ایک بے داغ انگریز ہے۔ان دنوں کا انگریز جب سورج نے سلطنت برطانیہ پر غروب

نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ایک ماڈ ٹیکنیشن ہے۔ ایک آرٹسٹ ہے رکھ کھاو کا ایک دیوانہ ہے۔ ایک امریکی اگزیکٹو ہے۔ ایک سائنسی زاویہ ہے۔ ہیلتھ کنسرن کا مارا ہوا ایک مریض ہے۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ایکسٹرا ادروٹ کا می۔ جسے ہر ایسے کام کا جنون ہے جس میں چیلنج ہو۔

حیرت کی بات ہے کہ اتنی طویل اور بے تکلف رفاقت کے بعد ہم اجنبی کیسے بن گئے۔ ہماری شخصیتوں نے مختلف رنگ کیسے دھار لئے۔

مثلاً میں بہت غصیل ہوں۔ بات بات پر غصہ کھاتا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ غصہ کھانے کی نہیں پینے کی چیز ہے۔

میں بات کہہ دینے کا قائل ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ بات کہہ دینا کوئی وصف نہیں۔ بلکہ جذباتیت کا مظہر ہے۔ اور جذباتیت کوئی خوبی نہیں۔ میں نے ساری زندگی جذبات کے تحت گزاری ہے میری دانست میں انسانیت کا شرف مثبت جذبے کی وجہ سے ہے فکر کی وجہ سے نہیں۔

عکسی جذباتی لت پت سے بہت خائف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اندر لت پت کی کیفیت موجود ہے جسے دبائے رکھنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں مصروف رہتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار کہا تھا ابو آپ کی محبت میرے لئے یوں ہے جیسے راب کا چھیٹر ہو۔ میں اس لت۔ پت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

میں روح کو مانتا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ روح بھی مادے کی ایک لطیف شکل ہے۔

مجھے ادب سے دلچسپی ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ ہمارا ادب حقائق سے گریز سکھاتا ہے۔ ہمارا ادب نذبات کا ایک جھنجھنا ہے اور ادیب اس جھنجھنے کو بجا بجا کر دل خوش کرتے رہتے ہیں۔

میں پیر پرست ہوں۔ وہ خدا پرست ہے۔ میرا خدا ڈکیٹر ہے۔ اس کا خدا منصوبہ بندی کا قائل ہے جس کا حکم آٹو میٹزم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

میں عقیدت پسند ہوں۔ وہ عقیدہ پسند ہے۔ میری زندگی میں باقاعدگی نہیں۔ وہ باقاعدگی کا دیوانہ ہے۔

میں چائے کا متوالہ ہوں۔ وہ چائے سے گریز کرتا ہے۔

مجھے مرچ سے رغبت ہے۔ اس کے نزدیک مرچ زہر ہے۔

میں لباس کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ لباس کو اہم جانتا ہے۔

میں سائنس سے مایوس ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سائنس ہماری واحد امید ہے چونکہ دور حاضر اس کے بل بوتے پر کھڑا ہے۔

میں مذہب کو جذبہ سمجھتا ہوں۔ وہ اسے ادراک سمجھتا ہے۔

میں عورت سے بے حد متاثر ہوں۔ تاثر شدید ہو تو اسے پلے باندھ لیتا ہوں۔ وہ عورت سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس سے گپ شپ اڑاتا ہے۔ اسے چھیڑتا ہے مگر پلے نہیں باندھتا۔

مجھے شعور ہے کہ شخصیت تضادات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مجھے عکسی کی شخصیت کے تضادات پر حیرت نہیں۔ حیرت یہ ہے کہ باپ اور بیٹا جو سولہ سال اکٹھے رہے وہ دونوں اجنبی کیسے بن گئے۔

ہر بات اپنی زندگی میں چند ایک امریکا ئیں دریافت کرتا ہے اور پھر اپنے بیٹے سے کہتا ہے بیٹا اگر تو ان امریکاؤں کو پلے نہیں باندھا لے تو مجھے علم ہے کہ کسی بیٹے نے آج تک باپ کی دریافت کی ہوئی امریکہ کو پلے نہیں باندھا۔ وہ اسے از خود دریافت کرنے پر مصر ہے۔

میں نے زندگی بھر حتی الوسع عکسی پر کوئی امریکہ نہیں ٹھونسی۔ باپ بن کر نصیحت نہیں کی۔ اسے ڈوز اور ڈونٹس کا سبق نہیں پڑھایا۔ پھر یہ دوری کس طرح عمل میں آئی؟ میں تو اس معمے کو نہیں سمجھ سکتا۔ شاید آپ سمجھ سکیں۔ عکسی کی کہانی ایک سیدھی سادی عام سی کہانی ہے۔

بچپن میں عکسی ایک گول مٹول بچہ تھا۔ جب وہ مدرسے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر ذہانت یا شرافت کی کوئی کرن نہ تھی۔ چہرہ گونگا انداز بے حس اکتاہٹ بھرا۔ کہنے سننے کا شوق نہ تھا۔ کھیل کود سے دلچسپی نہ تھی۔ ساتھی بننے یا بنانے کی نہ تو خواہش تھی اور نہ صلاحیت۔ وہ اکیلا بچہ تھا۔ اکیلا گونگا اور بے جان۔ جب وہ تین سال کا ہوا تو نہ جانے کیوں اس کا باپ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر باپ واپس آ گیا۔ باپ اسے انگلی سے لگا کر ایک نئے گھر چلا گیا۔ اسے سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کبھی باپ چھوڑ کر چلا جاتا ہے کبھی امی۔ اسے گرد و پیش پر اعتماد نہ رہا۔ اپنے باپ پر اعتماد نہ رہا کہ کب اسے چھوڑ کر چلا جائے۔ اس کے دل میں ڈر پیدا ہو گیا۔

پھر عکسی اور اس کا باپ اکیلے رہ گئے۔ یوں اکیلے جیسے کوئی والی وارث نہ ہو۔ وہ دونوں اکٹھے سوتے تھے۔ اکٹھے باتھ روم جاتے تھے۔ اکٹھے مدرسے جاتے تھے۔ اس کا باپ سکول ماسٹر تھا۔ جب وہ جماعت کا سبق دیتا تو عکسی دیوار سے لگ کر کھڑا رہتا۔ انتظار کرتا کہ کب ابا فارغ ہو کب واپس آئے۔ کہیں اسے چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ جب باپ سٹاف روم میں دوسرے اساتذہ کے پاس بیٹھا تو

عکسی کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا۔

وہ دونوں اکیلے رہتے تھے۔ نہ دوست نہ رشتہ دار نہ ساتھی۔ عکسی کو علم بے جان ہو گیا تھا۔

شاید اس تنہائی بے اعتمادی اور بے خوف کی وجہ سے عکسی گونگا اور بے جان ہو گیا تھا۔

پھر وہ تنہائی ٹوٹی اور ایک امی گھر آ گئی۔ یہ امی وہ امی نہ تھی۔ یہ تو ایک نئی امی تھی۔ وہ اور بھی گھبرا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی بہنیں آ گئیں اور گھر گھر بن گیا۔

جس گھر میں عکسی پرورش پا رہا تھا وہاں کتابیں تھیں کاغذ تھے پنسلیں تھیں غربت تھی موسیقی تھی آزادی تھی مادر پدر آزادی۔ باپ منشی تھا ہر وقت لکھتا رہتا تھا اور جب بھی لکھتا ریڈیو پر گانے لگا لیتا۔ چونکہ موسیقی کے بغیر وہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ کام ختم ہوتا تو وہ کتاب کھول کت پڑھنے لگتا۔ دوست آ جاتے تو بولنے لگتا پھر بولتا ہی چلا جاتا۔

غربت کی وجہ سے موسیقی کا واحد ذریعہ تھا۔ ریڈیو پر وہ ایسا اسٹیشن تلاش کیا کرتا تھا جہاں شدھ راگ ہو رہا ہو۔ اگرچہ شدھ راگ کی سوجھ بوجھ نہ تھی۔ نہ سر کی نہ تال کی لیکن شدھ راگ سن کر اس کے دل میں کچھ کچھ ہوتا تھا اور یہ کچھ کچھ تخلیق میں مدد کرتا تھا۔

عکسی کو شدھ راگ سے بیر تھا۔ اس لئے جب بھی موقع ملتا وہ سوئی گھما کر فلمی موسیقی لگا دیتا۔

پھر ایک روز ایک عجیب واقعہ عمل میں آیا۔ باپ بیٹھا کام کر رہا تھا۔ ریڈیو چل رہا تھا۔ لیکن پر شدھ کی بجائے فلمی گیت ہو رہے تھے۔ عکسی آیا اور اس نے سوئی گھما کر شدھ راگ لگا دیا۔ باپ چونکا۔ اس نے بیٹے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ عکسی کے چہرے پر بیداری کی پہلی کرن ناچ رہی تھی۔ پھر بھی باپ نے سے اہمیت نہ دی۔ وہ سمجھا کہ شاید مجھے خوش کرنے کے لئے پکا گانا لگایا ہے۔

پھر عکسی کی بہن سویرا نے شکایت کی کہ بھائی مجھے فلمی گیت سننے نہیں کیوں نہیں دیتے۔ عکسی غصے سے بولا۔ ''اسے شدھ گانا اچھا کیوں نہیں لگتا۔'' اس کے چہرے پر بیداری کی وہ اولین کرن بالکل ہی نمایاں ہو گئی۔

پھر میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ کراچی میں ولیج ایڈ کا دفتر تھا۔ جہاں عکسی اور میں دن کا بیشتر حصہ گزارتے تھے۔ اس دفتر میں فلم ساز تھے۔ پروجیکٹر تھے۔ کیمرے تھے۔ حفیظ جالندھری تھے۔ ٹیپ ریکارڈز تھے۔ احمد بشیر تھے۔ جو شومین شپ پارچہ فروشی گدھا گاڑی صاحفت کلرکی اور ریڈیو نویسی سے گھوم پھر کر اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

دفتر میں ابن انشاء تھا جو پورے طور پر ابن انشا نہیں بنا تھا۔ ابھی اس میں شیر محمد کا رنگ تھا۔ ابھی اس کا مزاج دکھ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ ابھی وہ آوارہ گرد نہیں بنا تھا۔ ان دنوں وہ سمجھتا تھا کہ محبت ''تیرے سامنے بیٹھ کر روناتے دکھ تینوں نہیں اودسنا'' ایسی کیفیت کا

نام ہے۔ انشاء کے علاوہ دفتر میں عنایت خان ستارہ نواز تھا اور قادر خان تھا جو بعد میں پیارنگ بن گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ دفتر میں عکسی اور میرے لئے گیت تھے' ٹھمریاں تھیں۔ حفیظ جالندھری تھے فلمی تصویریں تھیں۔ ابن انشائیوں تھیں۔ احمد بشیریاں تھیں اور پھر باتیں ہی باتیں' باتیں ہی باتیں۔

دفتر کے باہر قیصر تھا جو عکسی اور میرا واحد دوست تھا۔ قیصر ایک لنڈورا ہی تھا۔ جو دن بھر امریکی سفارتخانے میں دیوانوں کی طرح کام کرتا اور دفتر سے باہر نکل کر کافی ہاؤس سے سگرٹ سلگاتا' پیالے پر پیالا کافی پیتا اور بالآخر آدھی رات کے وقت کہیں جا کر ڈھیر ہو جاتا۔

کراچی میں جا کر ہم نے قیصر کو کافی ہاؤس سے نکال لیا۔ اس پر قیصر نے ہم سے انتقام لیا۔ اس نے ہم دونوں کو لنڈورے بنا دیا۔ ہم تینوں کیفی ٹریا میں چائے پیتے بازاروں میں گنڈریاں چوستے سٹالوں پر کھڑے ہو کر چاٹ کھاتے۔ کھوکھوں سے تکے کباب کھاتے اور گھٹیا فلم دیکھتے۔

عکسی کا کوئی اپنا دوست نہ تھا۔ لہٰذا وہ میرے دوستوں کے حلقے میں ہی رہا کرتا تھا۔ میرے دوستوں سے اس کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ اسے دوست سمجھا جائے' دوست کا بیٹا نہیں۔ اس سے ایسا سلوک نہ کیا جائے جیسا بڑے چھوٹوں سے کرتے ہیں۔ وہ بڑے چھوٹے کے امتیاز کے سخت خلاف تھا۔

احمد بشیر اور عکسی پرانے دوست تھے۔ وہ دونوں ۱۹۴۵ء سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ احمد بشیر نے عرصہ دراز سے اسے مساوی حقوق دے رکھے تھے۔ احمد بشیر خود مار گزیدہ تھا۔ اس کے والد نے اسے کبھی برابری کا درجہ نہ دیا تھا۔ ابن انشاء نے عکسی کو بحیثیت فرد تسلیم کر لیا تھا۔ قیصر عکسی کا پرانا ساتھی تھا۔ رہے حفیظ جالندھری' تو حفیظ نے کبھی کسی کو برابری کا درجہ نہ دیا تھا۔ باقی رہے شہاب اور اشفاق احمد۔

کراچی میں اشفاق احمد کی وجہ سے میں شہاب سے متعارف ہوا تھا۔ ابھی تعلقات ابتدائی منازل میں تھے۔ ویسے شہاب کی سرشت ایسی ہے کہ وہ اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے۔ دوسرے کو چھوٹا نہیں سمجھتے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ وہ چھوٹے کو سمجھتے ہی نہیں' گنتے ہی نہیں۔ اشفاق احمد اندر سے پیدائشی وڈیرا ہے۔ وہ کسی بچے' جوان یا عمر رسیدہ کو برابر کا نہیں سمجھتا۔ وہ تو بورئیے پر بیٹھ کر بھی چوکی پر بیٹھا رہتا ہے۔ ویسے چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتا ہے۔ لیکن انداز مربیانہ رہتا ہے۔ عکسی کو مربیانہ انداز سے چڑ تھی۔

کراچی میں عکسی' قیصر اور میں سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے رہتے۔ جب تھک جاتے تو احمد بشیر کے گھر جا بیٹھتے۔

احمد بشیر کا گھر گاؤں کا دارا تھا۔ شہر کا کلب تھا۔ مسافر خانہ تھا۔ راگ رنگ کا چوبارہ تھا۔ وہاں ہر وقت منڈلی لگی رہتی تھی۔ احمد بشیر کے گھر کی مالکن مودی، پیارنگ سے موسیقی سیکھتی تھی۔ سبق ختم کرنے کے بعد پیارنگ محفل موسیقی جما کر بیٹھ جاتا۔ وہ گائے جاتا۔ ہم سب سنتے۔ آدھی رات بیت جاتی۔ ان محفلوں میں عکسی بھی برابر کا شریک ہوتا۔

ایک روز محفل کے دوران طبلچی بازار سے سگریٹ خریدنے کے لیے چلا گیا۔ کچھ دیر تک تو پیارنگ طبلے کے بغیر ہی گاتا رہا۔ پھر عکسی نے لپک کر جوڑی اپنے سامنے رکھ لی۔ اور ازخود تین تال بجانی شروع کردی۔ اس پر تمام اہل محفل حیران رہ گئے۔ چونکہ عکسی نے پہلے کبھی جوڑی کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اگرچہ اس کی ضربیں کچی تھیں۔ مگر تال اور گر ٹھیک تھے۔

اگلے ہی روز میں نے عکسی کو ایک جوڑی خرید دی۔ پھر چند ایک ماہ وہ دیوانہ وار طبلہ بجاتا رہا۔ احمد بشیر نے کہا میں کسی طبلچی سے کہہ دوں کہ وہ باقاعدہ آکر تمہیں سکھاتا رہے۔ عکسی نے انکار کر دیا۔ جب وہ طبلہ بجاتا تو اس کا منہ سرخ ہو جاتا، کان کھڑے ہو جاتے۔ آنکھوں میں دیئے روشن ہو جاتے۔

دو سال ہم کراچی میں رہے اس کے بعد پھر سے میرا تبادلہ پنڈی ہو گیا۔ پنڈی آکر عکسی نے طبلہ بجانا چھوڑ دیا۔ جوڑی آج بھی ہمارے کاٹھ کباڑ میں پڑی ہے۔ اس دوران میں عکسی ایف اے کر چکا تھا۔ پنڈی میں آکر میں نے اسے گارڈن کالج میں داخل کرا دیا۔ گارڈن کالج میں داخلے کے بعد عکسی میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ پہلے وہ اپنا بیشتر وقت میرے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ اب وہ زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔

ایک روز میں نے پوچھا۔ ''آج کل کہاں ہوتے ہو تم؟''

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے ابو'' وہ بولا'' آج تک میں آپ کے دوستوں کے حلقے میں رہا ہوں۔ آپ کی سوسائٹی نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں، کوئی دوست نہیں، کوئی ہم عمر میرے قریب نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں تم ہم میں سے نہیں ہو۔ میں ان کے مشاغل میں شمولیت نہیں کرتا۔ کرتا ہوں تو اکھڑا اکھڑا رہتا ہوں۔ لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اپنے دوست بناؤں گا۔ ساتھیوں کا ایک حلقہ بناؤں گا۔ اپنے مشاغل پیدا کروں گا۔''

عکسی کی بات سن کر مجھے ایک اور دھچکا سا لگا۔ مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ اپنی سوسائٹی میں رکھ کر میں نے عکسی کو بوڑھا کر دیا ہے کہ میں نے اپنا آپ اس پر ٹھونس رکھا ہے کہ میں اس کے رستے کی رکاوٹ تھا۔ الٹا میں تو یہ خوش فہمی رچائے بیٹھا تھا کہ میں نے اسے پوری آزادی اور برابری دے رکھی ہے۔

اس کے بعد چند ایک مہینے ہم دونوں کے راستے الگ رہے۔ اس زمانے میں ہم چکلالہ کی گریسی لائنز میں ریکارڈ ونگ کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ریکارڈ ونگ کے صدر دروازے کے قریب اپنا ایزل رکھے عکسی کینوس پر تصویر بنا رہا ہے۔ اس وقت وہ تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ سامنے آئل کلر کی ٹیوبیں تھیں۔ ہاتھ میں برش کی جگہ چاقو تھا۔

''تصویر پینٹ کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاتھ آزما رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

عکسی کی یہ پینٹنگ آج بھی ہمارے گھر میں آویزاں ہے۔ میں خود تو تصویر کشی کے فن میں کورا ہوں۔ لیکن واقف کار لوگوں کا کہنا ہے کہ عکسی کی اس تصویر میں بڑی جان ہے' انفرادیت ہے۔ اس کے بعد کسی سے سیکھے بغیر کسی کو استاد مانے بغیر عکسی نے سات آٹھ کینوسز بنا ڈالیں۔ گھڑوں کا ایک ڈھیر' لاہور قلعے کا بیرونی منظر' درختوں کا جھنڈ' مری کا شہر دھوپ چھاؤں میں۔

''مری کا شہر'' ڈاکٹر عفت شہاب کو اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے اسے لے جا کر اپنے ڈرائنگ روم میں لٹکا دیا۔

ایک روز عفت نے کہا۔ ''عکسی تو تصویریں بنانے کا کاروبار کیوں نہیں کرتا؟ بڑا پیسہ ہے اس کاروبار میں۔''

''پیسے کے لیے تصویریں بناؤں!'' عکسی ہنسا۔

''پیسے کے لیے نہ سہی' میرے لیے بناؤ۔'' وہ بولی۔

''اچھا'' عکسی پھر ہنسا۔

''ہمارے ہاں جو مہمان آتے ہیں وہ تمہاری تصویر میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ پھر میں تمہاری سیلز مین بن جاتی ہوں۔ میں نے انہیں ایک ہزار فی تصویر پر آمادہ کر لیا ہے۔''

''اچھا!'' عکسی ہنسا۔ ''بڑی قیمت پڑ رہی ہے میری تصویر کی۔''

''تمہاری تصویر کو کون پوچھتا ہے؟'' وہ بولی۔ ''یہ تو میری سیلز مین شپ کا اعجاز ہے۔ تصویر کا دو سو روپیہ تمہیں دے دیا کروں گی۔ باقی آٹھ سو میرا کمیشن۔''

انہی دنوں عکسی نے ایک نیا پینترا بدلا۔ اس میں ایک فرنگی نے انگڑائی لی اور وہ بڑی تیزی اور شدت سے مسٹر بننے لگا۔ عام مسٹر نہیں بلکہ ضمیر جعفری والا مسٹر' جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے۔

''کہ کھلتے کھلتے ڈیڑھ گھنٹے میں کہیں مسٹر کھلا''

سوٹ، سلف کالر ٹائی کے بعد وہ ہونٹ بنا بنا کر انگریزی بولنے لگا۔ پہلے ہی عکسی کی اردو سے انگریزیت کی بو آتی تھی چونکہ دسویں تک اس نے انگلش اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ اب اس کی انگریزی سے آکسفورڈ کی بو آنے لگی۔ اس پر گھر والوں کے لیے خاصی مشکل پیدا ہوگئی۔

طبلہ نوازی اور مصوری تو خیر چل گئے تھے۔ انگریزیت گھر والوں کے حلق میں کانٹا بن کر پھنس گئی۔

گھر میں سب ٹھیٹھ پنجابی تھے۔ بوریہ نشین تھے۔ باپ سالہا سال سے ادیب ہونے کے باوجود اردو پنجابی میں بولتا تھا اور وہ بھی معمول کے طور پر نہیں بلکہ تقریبات پر۔ ادیبوں کی محفلوں میں بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے انداز کو اپنا نہ سکا تھا۔ اس پر ادبی کلف نہ چڑھی تھی۔ عکسی کے اس نئے رنگ سے وہ بہت سٹپٹایا۔ انگریزی تو خیر اسے آتی تھی۔ دفتری انگریزی نہیں بلکہ جدید انگریزی۔ لیکن وہ لکھنے والی انگریزی تھی' بولنے والی نہیں۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ لکھنے والی انگریزی کو کون پوچھتا ہے وہ نہ آپ کو بنا سکتی ہے نہ سنوار سکتی ہے۔ اور بولنے والی انگریزی کیا نہیں کرسکتی۔ اس کا توراج ہے۔ ہمیشہ رہا ہے۔

ان دنوں عکسی بڑے شدت سے انگریزیت کے جوہڑ میں ڈبکیاں کھاتا رہا۔ کالج کے سیمیناروں' ڈس کشنز' ٹاک' پارلیمنٹ' ہاؤس آف کامنز' ڈکلےمیٹشز میں حصہ لیتا رہا۔

پھر اسے عشق کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ کسی لڑکی سے عشق ہوتا تو بات سمجھ میں آتی چونکہ باپ عشقی کیفیت کے جملہ کوائف سے پورے طور پر واقف تھا۔ عشق ہوا بھی تو الیکٹرانک مشینوں سے جن کے متعلق باپ جاہل مطلق تھا۔ اس انوکھے عشق میں عکسی کی کیفیت مجنوں کی سی تھی۔ مجنوں صحرا نوردی کیا کرتا تھا۔ عکسی نے جنک شاپ نوردی شروع کردی۔ روز وہ بلا ناغہ شہر کے تمام کباڑیوں کی دکانوں میں باری باری جاتا۔ وہاں پڑی ہوئی مشینوں کو دیکھتا' سمجھنے کی کوشش کرتا' چلاتا پھر گھر آکر آہیں بھر بھر کر مجھے سمجھاتا۔ ابو ہزاروں کا ریکارڈ چینجر کوڑیوں پر بک رہا ہے۔ نایاب اسٹیج ساؤنڈ سسٹم کوڑیوں کے حساب مل سکتا ہے۔ کباڑیئے کو علم ہی نہیں کہ وہ نایاب ہے۔ پھر اس زمانے میں پہلی مرتبہ عکسی کو احساس ہوا کہ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا ہے۔

اس کے باوجود گھر میں کئی ایک مشینیں آگئیں۔ ریکارڈز چینجر' مائک' لاؤڈ اسپیکر' ٹیپ ریکارڈر۔۔۔۔۔۔ آج بھی کباڑیوں کی دکانوں کا جائزہ لینا اس کا مرغوب مشغلہ ہے۔

انہی دنوں اس نے اپنا معمول پھر سے بدل لیا۔ وہ زیادہ تر وقت گھر پر بسر کرنے لگا۔ ایک دن میں نے پوچھا۔ "عکسی اتم نے

باہر جانا کیوں چھوڑ دیا؟''

پہلے تو وہ خاموش رہا پھر میرے اصرار پر کہنے لگا۔ ''بیکار ہے بابو! بالکل بیکار۔ مجھ میں دوسروں کو دوست بنانے کی صلاحیت ہی نہیں۔ میں نے بہت کوشش کر دیکھی ہے اپنی سرشت کو بدلنے کی کوشش کر دیکھی۔ میں نے اپنا رنگ بدلنے کی کوشش کی' لیکن سب بیکار ہیں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں ان کے مشاغل اپنا نہ سکا۔ میرے خیالات مختلف ہیں' احساسات مختلف ہیں' دلچسپیاں مختلف ہیں۔ مجھ میں جوانی کا سودا ہاٹ نہیں ہے۔'' اور وہ رک گیا۔ ''دراصل آپ کی سوسائٹی میں رہنے کی وجہ سے میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ہم عمروں کی باتیں مجھے گھٹیا لگتی ہیں۔ نوجوانوں کے مشاغل بے معنی نظر آتے ہیں۔''

زندگی بھر عکسی نے صرف چار ایک ہم عمروں سے تعلقات پیدا کئے لیکن کوشش کے باوجود یہ تعلقات دوستی تک نہ پہنچ سکے۔

ڈاکٹر جہانگیر عکسی کا واحد دوست ہے۔ اگر ان کی دوستی آج تک نبھ رہی ہے تو اس کا سہرا جہانگیر کے سر پر ہے۔ سینٹ میری سکول میں وہ ایک دوسرے کے ساتھی بنے تھے۔ لیکن یہ ساتھ ایک ہاتھ کی تالی کے مترادف ہے۔ جہانگیر کو ایک ہاتھ کی تالی بجانے میں ملکہ حاصل ہے۔ پھر مظفر ہے' نجم ہے' صادق ہے' افضل ہے۔ ان سب سے عکسی کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ منہ زبانی کے تعلقات۔

یہ تعلقات عکسی نے اپنے زمانے میں پیدا کئے تھے جب وہ بی اے میں تھا۔ بی اے کے بعد اس نے ایم اے نفسیات میں داخلہ لیا۔ ایم اے کے اختتام پر لیبارٹری میں پریکٹیکل ٹریننگ کے لیے اسے لاہور گورنمنٹ کالج جانا پڑا۔

لاہور میں وہ چھ ماہ بانو قدسیہ کے گھر میں رہا۔ بانو قدسیہ کے گھر کا نام داستان سرائے نہیں بلکہ رنگ پچکاری ہونا چاہیے۔ چھ ماہ عکسی اس رنگ پچکاری میں بھیگا بٹیر بن کر بیٹھا رہا۔

ایم اے کرنے کے بعد وہ گارڈن کالج میں لیکچرار ہو گیا۔

انہی دنوں میں نے عکسی سے کہا۔ ''مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم گورنمنٹ سروس نہیں کرو گے۔''

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر گورنمنٹ سروس کرنی ہے تو سی ایس پی کرنا لازم ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بے عزتی کی نوکری کرو۔''

''میں سی ایس پی کروں گا ابو'' اس نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ تیاری میں مصروف ہو گیا۔

عکسی کو مطالعہ کا شوق نہ تھا۔ اسے امتحان پاس کرنے کا گر آتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کیا کرتا تھا۔ وہ کہا

کرتا تھا۔ ''ابو امتحان مطالعہ یا محنت سے پاس نہیں ہوتا' سوجھ بوجھ کے زور پر ہوتا ہے۔''

ڈیڑھ سال کے بعد عکسی میرے پاس آیا' کہنے لگا۔ ''ابو میں نے سی ایس پی کی تیاری کر لی ہے۔ میں اچھی پوزیشن حاصل کروں گا۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

لیکن اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''کیا یہ ضروری ہے کہ میں سی ایس بنوں؟''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم عزت کی نوکری کرو۔''

''میں سی ایس پی کو عزت کی نوکری نہیں سمجھتا۔''

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''میں سی ایس پی بننا نہیں چاہتا۔'' وہ بولا۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔''

''اس لیے کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں محنت کرنے سے جی چراتا ہوں۔ اب فیصلہ آپ پر ہے اگر آپ بضد ہیں کہ میں سی ایس پی بنوں تو امتحان دے دوں گا ورنہ نہیں۔''

میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں نے اپنے بچوں کو خوش فہمی دے رکھی ہے کہ میں بہت وسیع القلب ہوں اور ان کی رضامندی کے بغیر کوئی کام ان پر ٹھونسنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ بہر حال اس روز میرا جی چاہتا تھا کہ فراخ دلی کا وہ ڈھونگ چاک چاک کر کے رکھ دوں۔ لیکن مجھ میں جرات نہ ہوئی۔ مجبوراً سینے پر پتھر رکھ کر میں نے عکسی کی بات مان لی۔

پھر ۱۹۶۷ء میں وہ واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے عکسی کی شخصیت کے ایوان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ پچیس سال کی عادتیں جڑوں سمیت اکھاڑ دیں۔ پچیس سال کے تعلقات گڈمڈ کر دیئے۔ اس نے گویا عکسی کو ایک بے سروسامان مہاجر بنا دیا۔ مجھے علم نہیں کہ وہ واقعہ کیا تھا۔ اس کی تفصیلات کیا تھیں۔ اس کی نوعیت کی تھی۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس روز کوئی ہاتھی چینی کی دکان میں گھس آیا تھا۔

وہ واقعہ رات کے پچھلے پہر ہوا۔ جب ہم گہری نیند سو رہے تھے۔ صبح سویرے جب میں باتھ روم جانے کے لیے جاگا تو میں نے دیکھا کہ عکسی کے کمرے کی بتی جل رہی ہے۔ یہ تفصیل بہت حیران کن تھی۔ چونکہ عادی طور پر عکسی صبح نو بجے کے قریب جاگتا تھا۔ صبح سویرے جاگنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ خیال آیا دیکھوں تو سہی' بات کیا ہے۔

میں نے کمرے میں جھانکا تو میرا منہ مارے حیرانی کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔عکسی کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔عکسی نے عید کے سوا کبھی نماز نہ پڑھی تھی۔اسے اسلامیات یا دینیات سے نہ تو واقفیت تھی نہ دلچسپی۔اگرچہ امی باقاعدہ طور پر نماز پڑھتی تھی لیکن باپ کی وجہ سے گھر کے ماحول میں اسلام کی جھلک نہ تھی۔

بہرحال باتھ روم سے فارغ ہو کر میں پھر سو گیا۔دوبارہ جاگا تو عکسی کی امی نے مجھے اشارہ کیا۔بولی ''ذرا اٹھ کر عکسی کے کمرے میں جھانک کر تو دیکھئے۔''میں نے دیکھا تو عکسی بیٹھا قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا۔جب وہ چائے پینے کے لیے کمرے سے باہر نکلا تو اسے دیکھ کر میں ڈر گیا۔منہ سرخ ہو رہا تھا۔چہرہ سوجا ہوا تھا۔آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔انداز میں دیوانگی نمایاں تھی۔اسے تخت پوش پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کسی درگاہ کے دروازے پر کوئی مست بیٹھا ہو۔

اس روز عکسی نے چائے پینے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ چائے کا رسیا تھا۔صرف چائے ہی نہیں اس روز اس نے تمام معمولات کو بدل دیا۔گھر والے حیران تھے۔میں سخت گھبرا گیا۔میں نے ڈرتے ڈرتے عکسی سے پوچھا۔''کیا بات ہے عکسی؟''

''ضرور کوئی بات ہے۔''عکسی کی امی بولی۔

عکسی نے اپنی ابنارمل کیفیت کو دبانے کی شدید کوشش کی جس وجہ سے اس کا چہرہ اور بھی بھیانک ہو گیا۔بولا ''کچھ نہیں ابو کچھ بھی نہیں۔''

''کچھ تو ہے۔''میں نے کہا۔

''نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں۔کوئی خاص بات نہیں۔ایک عام سا مشاہدہ ہے عام سا مشاہدہ۔جو بہت سوں کو ہوگا۔بہت سوں کو۔آپ کو بھی ہوگا ابو۔''

''لیکن ہوا کیا؟''میں نے پوچھا۔

''ایک مشاہدہ ایک ویژن'' وہ بولا ''پاکستان کی آنے والی عظمت کا ویژن۔ابورات کے پچھلے پہر سورج میرے کمرے کے اندر گھس آیا۔اس وقت اس میں حدت نہ تھی۔صرف نور ہی نور تھا۔میں چکا چوند ہو کر رہ گیا۔پھر وہ سورج سمٹ کر پاکستان بن گیا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔دیر تک خاموش بیٹھا فضا کو گھورتا رہا۔اس وقت اس کے چہرے پر دیوانگی کے اثرات بالکل ہی نمایاں تھے۔

''ابو یہ مشاہدہ صرف مجھے ہی نہیں بہت سوں کو ہوگا۔پچاس سال کے اندر اندر سب اس کا تماشا کریں گے۔''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

''ابو آپ پاکستان کو نہیں جانتے۔ نہیں جانتے۔'' اس کی آواز بیٹھی بیٹھی تھی۔ ''میں جانتا ہوں' پہلے نہیں جانتا تھا اب جانتا ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ کیا دیکھا ہے۔ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔'' وہ پھر خاموش ہو گیا جیسے بیتی بات کو پھر سے بیت رہا ہو۔

''باپو!'' وہ بولا'' پاکستان نے دنیا کی رہنمائی کرنی ہے۔ دنیا کو راستہ دکھانا ہے۔ اب میں سول سرونٹ ہوں۔ ابو مجھے پاکستان کی چاکری عطا کر دی گئی ہے۔ بہت سوں کو یہ چاکری عطا کی جائے گی۔ بہت سوں کو۔ مجھے اب پڑھنا ہے۔ مطالعہ مطالعہ مطالعہ

اس کے بعد عکسی اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔

اس نے فزکس' کاسمالوجی' بائیالوجی اور سائنس کے دیگر موضوعات پر ابتدائی مگر بنیادی معلومات دینے والی کتابیں اکٹھی کر لیں اور دیوانہ وار مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

اس کے باوجود اس کی کیفیت ویسی ہی رہی۔ منہ سرخ اور سوجا ہوا' آنکھیں پھٹی پھٹی' چہرے پر وہی وحشت۔ سارا دن وہ اپنے کمرے میں بند رہتا۔ ہمیں اس کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا' جیسے آسیب زدہ ہو۔

پھر عکسی کے ایک دوست نے لات مار کر عظمت پاکستان کا وہ مینار پاش پاش کر دیا۔ بولا'' یہ سب فتنہ وفساد ایک لڑکی کا اٹھایا ہوا ہے۔''

اس لڑکی سے میں مل چکا تھا۔

ایم اے کرنے کے بعد میں نے عکسی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنا جیون ساتھی خود تلاش کر چکو تو مجھے بتا دینا۔ پھر میرا کام شروع ہو گا۔ اس کے لواحقین سے میں خود جا کر ملوں گا۔ ان کی منتیں کروں گا۔ ہاتھ جوڑوں گا۔ اس پر بھی وہ راضی نہ ہوئے تو ہم لڑکی کو اغوا کر لیں گے۔''

''اغوا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' عکسی جھنجھلا کر بولا۔

''بڑی ضرورت ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہیں نہیں پتہ' اپنے چناؤ کی لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ ناکامی ہو جائے تو شدید جھٹکا لگتا ہے۔ ناکامی تسلیم کر لو تو تمہاری ''میں'' میں ایک ٹوٹ رہ جاتی ہے۔ جس طرح شیشے کے گلاس میں بال آ جائے تو وہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔''

ایک روز عکسی میرے پاس آیا اور بولا ''ابو آپ مصروف تو نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں''

بولا ''ذرا باہر چل کر میرے دوست سے مل لیں۔''

جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہے۔

''یہ میرے ابا ہیں۔'' عکسی بولا۔ ''اور یہ میری دوست ہیں۔۔۔۔۔۔''

ہاں' میں اس لڑکی سے مل چکا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو عکسی کہنے لگا۔ ''ابو! اگر میں اس لڑکی کو جیون ساتھی بنا لوں تو۔۔۔۔۔۔ آپ کی کیا رائے ہے؟''

''کیا تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''محبت وحبت نہیں' میں اسے پسند کرتا ہوں۔''

وہ ایک چٹ کپڑی لڑکی تھی۔ میں نے زندگی بھر کبھی چٹ کپڑی لڑکی نہ دیکھی تھی۔ لڑکیاں تو رنگ دار ہوتی ہیں' دھاری دار ہوتی ہیں۔ البتہ میں نے زندگی میں چند ایک چٹ کپڑی خواتین ضرور دیکھی ہیں۔ چٹ کپڑی سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ وہ صرف سفید لباس پہننے کی شوقین ہوتی ہیں یا سادہ مرادی رہنا پسند کرتی ہیں۔ بے شک وہ سفید اور سادہ لباس پہنتی ہیں۔ بظاہر سنگھار سے بے نیاز ہوتی ہے۔ نہیں ایسی بات نہیں۔ یہ بے نیازی صرف بظاہر ہوتی ہے۔

سنگھار جب درجہ کمال پر پہنچتا ہے تو ایک ایسی کیفیت عمل میں آتی ہے کہ دیکھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے محترمہ سنگھار سے بے نیاز ہو۔ چٹ کپڑی سنگھار کے اس درجہ کمال سے واقف ہوتی ہے۔ اسے ہر سرسری جنبش کا شعور ہوتا ہے اور اس کے اثرات کا واضح علم ہوتا ہے۔ یوں جان لیجئے کہ چٹ کپڑی نسائیت کا ایک خاص رخ ہے' ایک نمونہ ہے' ایک طریق کار ہے' ایک کردار ہے۔ میری دانست میں چٹ کپڑی نسائیت کی دودھ بھری کڑاہی کی بالائی ہوتی ہے۔ چٹ کپڑی کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ لیکن اگر چٹ کپڑی مہربان ہو جائے تو پھر جنت میں جانے کی آرزو نہیں رہتی۔

عکسی کے دوست نے مجھے بتایا کہ دونوں کے درمیان شادی کے عہد و پیمان ہو چکے ہیں۔ عکسی نے کہا' میرا انتظار کرو۔ پھر ایک روز عکسی کو اس کا خط ملا۔ لکھا تھا ''گھر والے میری شادی ایک کپتان سے کرنا چاہتے ہیں۔ میری کوئی نہیں سنتا۔ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔''

عکسی نے یہ بات مجھے نہ بتائی۔ پتہ نہیں کیوں؟ شاید اس لیے کہ عادی طور پر وہ حتی الوسع مجھے تکلیف دینے سے گریز کرتا تھا۔ یا شاید اس لیے کہ اسے ڈر تھا کہ میں اپنی جذباتیت کی وجہ سے صورت حال کو اور خراب نہ کر دوں۔

عکسی نے سوچا سیدھی بات ہے لڑکی کے متعلقین پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ خاندان متمدن ہے۔ لڑکی سے میرے تعلقات بڑے پاکیزہ اور خوشگوار ہیں۔ ان میں ناخوشگواری یا غیر مناسب کا عنصر نہیں تو کیوں نہ خود ان سے مل کر بات کروں۔ وہ سمجھ جائیں گے یقیناً سمجھ جائیں گے۔

جب عکسی نے ان سے بات کی تو سمجھنے کی بجائے وہ گھورنے لگے۔ گھورنے کے بعد عکسی اور اس کے خاندان کو بے نقط سنائیں اور پھر اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ چٹ کپڑی چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی۔

عکسی کے دوست کی زبانی یہ تفصیلات سن کر میں سخت گھبرا گیا۔ اگرچہ میرا ایمان تھا کہ عکسی نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پھر بھی مجھے شک پڑنے لگا کہ شاید صدمے کی وجہ سے اس کا ذہن گڈمڈ ہو گیا ہے اور شاک کی وجہ سے رات کے وقت اس کے کمرے میں سورج طلوع ہو گیا ہے۔

کئی ایک دن میں نے بڑے تذبذب میں گزارے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ عکسی کو واقعی مشاہدہ ہوا تھا یا یہ سب دماغ کا خلل تھا۔ آخر میں نے قدرت اللہ شہاب سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے حلقہ ارباب میں صرف قدرت اللہ ہی ایسا فرد ہے جو روحانیت اور عقل و دانش دونوں کو ہم آہنگ سمجھتا ہے۔ انہیں متضاد نہیں جانتا۔ قدرت اللہ کا ایمان ہے کہ عقل و خرد روحانیت کے لیے باعث تقویت ہیں۔ میں نے قدرت اللہ سے کہا' مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ یہ مشاہدہ تھا یا چٹ کپڑی کا اعجاز۔

میری بات سن کر ڈاکٹر عفت قہقہہ مار کر ہنسی' بولی۔ ''اس واقعہ کا چٹ کپڑی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں۔'' وہ بولیں۔ ''اس لیے کہ میں اسے جانتی ہوں۔''

''آپ کیسے جانتی ہیں؟''

''میں چٹ کپڑی کے متعلق ہر تفصیل جانتی ہوں۔''

''آپ کو کیسے علم ہے؟''

''عکسی مجھے ہر تفصیل سے آگاہ رکھتا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ لڑکی کا واقعہ بالکل الگ ہے۔ چونکہ دونوں واقعات صرف آٹھ دس دنوں کے وقفے سے ہوئے ہیں۔ اس لیے غلط فہمی کی گنجائش ہے۔''

''تو کیا واقعی عکسی کو مشاہدہ ہوا ہے؟'' میں نے قدرت اللہ سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ مشاہدہ ہوا ہے یا نہیں۔ البتہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دماغ کا خلل نہیں' نہ ہی خود فریبی ہے۔'' قدرت اللہ نے کہا۔ ''میری دانست میں عکسی کو ملک سے باہر بھیج دینا چاہیے۔ ایک تو چینج ہو جائے گی۔ دوسرے عکسی کو باہر جانے کا شوق ہے۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ عکسی کو سکالرشپ دلا کر چیکوسلواکیہ بھجوا دیا گیا۔

پراگ میں عکسی دو سال مقیم رہا۔ اس دوران میں اس پر وہی کیفیت طاری رہی' وہی دیوانگی' وہی مطالعے کا جنون' وہی اللہ ہو' اللہ ہو' اللہ ہو۔

پراگ سے عکسی کا ہر خط جو مجھے موصول ہوتا رہا تھا اسی کیفیت کا غماز تھا۔ اگرچہ اپنے خطوط میں وہ ذاتی کیفیت کے اظہار سے گریز کرتا تھا۔ پھر بھی بات چھلک کر باہر نکل آتی۔ اس کے خطوط میں ضبط اور شدت نمایاں تھی۔ ان کے علاوہ جا بجا اللہ اور پاکستان کا تذکرہ ہوتا۔ مثلاً ایک خط ملاحظہ ہو۔

''ابو! چیک ایک مایوس قوم ہے۔ انہوں نے اپنی امیدوں کے سارے انڈے مارکسزم کی ٹوکری میں ڈال رکھے تھے۔ مارکسزم کا رنگین وعدہ ایفا نہ ہوا۔ جس سے انہیں دھچکا لگا اور سارے انڈے ٹوٹ گئے۔

اہل مشرق کے پاس اللہ ہے۔ اہل مغرب کے پاس زر ہے۔ چیک کے پاس نہ اللہ ہے' نہ زر ہے۔ پھر وہ کس امید پر جیئے۔ اسے پتہ نہیں کہ وہ کدھر سے آ رہا ہے' کدھر جا رہا ہے کہ اس کی منزل کیا ہے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے۔

اس کی گہری مایوسی کی وجہ سے ایک طوفا ابھر رہا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پاکستان میں ایک طوفان بن رہا ہے۔ چیک کے دل میں ابھرنے والا طوفان مثبت نہیں۔ پاکستان میں عظیم واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اللہ ایک عظیم پلانر ہے۔ ابو وہ معجزوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے عظیم نتائج پیدا کرتا ہے۔ پاکستان میں عظیم نتائج رونما ہوں گے۔ انشاء اللہ''

۱۹۶۹ء میں عکسی چیکوسلواکیہ سے واپس آ گیا۔ لیکن یہ وہ عکسی نہیں تھا جس کے ساتھ میں نے زندگی کے پچیس سال گزارے تھے۔

مجھے علم نہیں کہ پراگ میں اس پر کیا بیتی۔ البتہ اس بیتی کی شدت کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ وہ تیس نوٹ بکیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس کے مشاغل کا پتہ دیتی تھیں۔

ان کاپیوں میں مضامین نہیں بلکہ مختصر نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ ان کا موضوع وحدانیت تھا۔ کہیں اعداد کی بنیاد پر وحدانیت کا مسئلہ حل کیا ہوا تھا' کہیں روشنی اور رنگ کی بنیاد پر' کہیں ایٹم کی مدد سے وحدانیت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ کہیں سبز پتے کی ساخت کی مدد سے۔

عکسی کی واپسی پر ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ عکسی سے پراگ کی بات نہیں کریں گے۔ شاید اسی وجہ سے سارا گھر پراگ سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے پھوڑا پیپ سے بھرا ہوتا ہے۔

آخر ایک روز بے خبری میں بات میرے منہ سے نکل گئی۔ برسبیل تذکرہ میں نے کہہ دیا۔ یوں معلوم پڑتا ہے کہ پراگ میں تم پھانسی پر لٹکے رہے۔ عکسی کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ کہنے لگا ''ہاں ابو' پھانسی پر لٹکا رہا۔ کاش وہ دن پرسے لوٹ آئیں اور میں ایک بار پھر پھانسی پر لٹک جاؤں۔ لیکن اب شاید ایسا کبھی نہ ہو' کبھی نہیں۔ کھو دیا ابو! سب کھو دیا۔ اب میں ایک خالی برتن ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے غبارے کی ساری پھونک نکل گئی ہو۔ اب میں ایک چھچھڑا ہوں چھچھڑا۔ زندگی میں کوئی مقصد نہیں رہا۔ کوئی منزل نہیں۔ اب میں ایک خلا ہوں' بھیانک خلا۔''

پھر یوں ہوا جیسے سمیر نگیب کی آمد پر وہ خلا بھر گیا۔

سمیر نگیب ایک مصری نوجوان تھا۔ خوش شکل' رنگین مزاج' ہنسوڑ۔ وہ یونیسکو کا ایک ایکسپرٹ تھا جسے پاکستان کے لوک گیت جمع کرنے کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔

وزارت تعلیم کے لیے سمیر نگیب کی آمد ایک غیر ازمعمولی بات تھی۔ یونیسکو نے پہلے بھی کئی ایک مطالبات کیے تھے۔ لیکن وہ اپنی نوعیت میں کاغذی تھے۔ یعنی کاغذ پر لکھے ہوئے تھے جن کا جواب کاغذ پر دے دیا جاتا تھا۔ یونیسکو کا یوں ایک جیتے جاگتے آدمی کو بھیج دینا اور عملی کام کا مطالبہ کرنا واقعی یہ بات معمول سے بہت ہٹ کر تھی۔ اس قدر ہٹ کر تھی کہ وزارت تعلیم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔

بہر حال انہوں نے سمیر نگیب کو انٹر کان میں ٹھہرا دیا۔ بولے ''آپ چند ایک روز آرام کریں جب تک ہم لوک گیتوں کا انتظام کیے دیتے ہیں۔''

دفعتاً وزارت کو خیال آیا کہ گیتوں کا بادشاہ ریڈیو پاکستان جو ہے۔ انہوں نے ریڈیو سے بات کی۔ ریڈیو نے کہا کہ ہم تو صرف وہ گیت اکٹھے کرتے ہیں جنہیں لوگ سنتے ہیں وہ گیت اکٹھے نہیں کرتے جو لوگ گاتے ہیں۔

اس پر وزارت کا دل ٹوٹ گیا۔

ادھر انٹرکان میں سمیر نگیب بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ پھر وہ اکتا کر اٹھ بیٹھا اور ٹہل ٹہل کا انتظار کرنے لگا۔

انٹرکان کا مغربیت زدہ ماحول اس کے لیے جاذب توجہ نہ تھا۔ وہ تو مغربیت سے اکتایا ہوا تھا اور خالص مشرقیت کے ماحول میں رہنے کا خواہش مند تھا۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا جب تک میں ذاتی طور پر کوشش کیوں نہ کروں' پاکستانی لوک گیتوں کا پتہ کروں۔ کسی رنگین مزاج نے اسے ہیرا منڈی کا پتہ بتا دیا۔

ہیرا منڈی سمیر نگیب کو بہت پسند آئی۔ وہاں مشرقیت کی جھلک تھی جو اسے نئی نظر آئی۔ دو مہینے وہ ہیرا منڈی کی بائیوں سے گیت سنتا اور چٹکیاں بجاتا رہا۔ پھر کسی نے یہ کہہ کر کہ یہ لوک گیت نہیں' یہ تو چوبارہ گیت ہیں' اس کا دل توڑ دیا۔ اس پر وہ سیدھا سیکرٹری تعلیم سے جا کر ملا۔ بولا میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ آپ نے ابھی تک لوک گیتوں کا کوئی ایسا انتظام نہیں کیا۔ ان دنوں قدرت اللہ شہاب وزارت تعلیم کے سیکرٹری تھے۔ انہوں نے عکسی کو سمیر نگیب کا معاون مقرر کر دیا۔

عکسی نے سمیر نگیب کو سمجھایا کہ بھلے آدمی پاکستانی لوک گیتوں کو اکٹھا کرنا آسان کام نہیں۔ پاکستانی لوک گیت بائیوں کے چوباروں میں نہیں ملتے' نہ ہی آرٹ کونسلوں میں ملتے ہیں۔ انہیں اکٹھا کرنے کے لیے دور افتادہ گاؤں میں جانا پڑے گا۔ ان گاؤں میں جہاں شہر کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے۔ جہاں لوک گویے دم توڑ رہے ہیں' وہاں پہنچنے کے لیے پیدل چلنا ہوگا۔ مقامی لباس پہننا ہوگا۔ ٹرک ہوٹلوں سے کڑک چائے پینے کی عادت ڈالنی ہوگی۔

آٹھ روز عکسی سمیر نگیب کو ٹریننگ دیتا رہا۔ یونیسکو کے فوک اور ایکسپرٹ کے لیے یہ انوکھی ٹریننگ تھی۔ پھر وہ دونوں سندھ' بلوچستان' مکران' تھرپارکر' سرحد کے دور افتادہ دیہات کی طرف نکل گئے۔ جہاں مظلوم پاکستانی کلچر مغرب زدہ شہر' کالا صاحب اور ماڈرن ازم سے ڈرا ہوا بیٹھا ہے۔ جہاں پاکستانی لوک گیت کسمپرسی کے عالم میں دم توڑ رہے ہیں۔ جہاں پاکستانی دیہات کے منفرد ساز دیواروں پر ٹنگے کرم خوردہ ہو چکے ہیں۔ پتہ نہیں عکسی نے وہاں کیا دیکھا۔ شاید اس نے پاکستانی عظمت کے اس ویژن کی تعبیر کی جھلک دیکھی ہو یا شاید پاکستان کے درخشندہ مستقبل کی کرن پھر سے اس کے دل کی گہرائیوں میں چمکی ہو۔ شاید پاکستان کے اس ادنیٰ چاکر کو راستہ مل گیا ہو۔

بہر حال جب وہ لوٹا تو اس کی تمام تر توجہ پاکستان کی لوک ریت پر مرکوز ہو چکی تھی۔ پہلے اس کی دیوانگی کا مرکز مطالعہ تھا' اب لوک ریت ہے۔لوک ریت کے جنون نے اسے کا می بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے شہر کے فرزانوں کی نگاہ میں وہ لوک تماشا بنا ہوا ہے۔

◆◆◆

کالا شاہ

(شبیر شاہ)

صاحبو! دعا کرو کہ یہاں کوئی آدمی پیدا نہ ہو جو بھی ہوا دکھی ہوا۔ ہم نے اسے سکھی نہ رہنے دیا۔ صرف اس لئے کہ بڑا تھا۔ سیانے کہتے ہیں یہ دنیا میڈیا کرز کی دنیا ہے۔ سچ کہتے ہیں بڑے سے میری مراد وہ بڑا نہیں جس سے سر پر دولت یا اقتدار کا تاج ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

Heavy lives head that wears tha crown.

اس heaviness کے خواہش مند تو اللہ کے فضل سے ہمارے ہاں بہت سے ہیں اور ان کے لئے فضا بڑی سازگار ہے۔

بڑے سے میرا مطلب وہ فرد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتیں عطا کی ہوں۔

بڑے بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔

ایک تو یہ مطلب ہے جسے علامہ مشرقی کہتے ہیں۔ جسے خراج تحسین پیش کرنے کے لئے آج ہم سب یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

لیکن صاحبو! یہ بڑا بہت ہی بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ مجھ سا کہانیاں کہنے والا چھوٹا آدمی اس کا ادراک نہیں رکھ سکتا۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے میں اہلیت نہیں رکھتا' حیثیت نہیں رکھتا۔

اس بڑے جسے علامہ کہتے ہمیں کہنا نہیں چاہیے۔ چونکہ آج اس لفظ کا Conotation بدل چکا ہے۔ مگر لوگ کہتے ہیں کیا کیا جائے۔

علامہ نے ایک شخص کو Inspire کیا۔ اس شدت سے انسپائر کیا کہ اس نے علامہ سے محبت کی۔ اس حد تک عقیدت کی کہ نوبت Identification تک جا پہنچی۔

He lived Allama all his life

صوفی کہتے ہیں۔

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی۔ علامہ کو اللہ نے بڑا بنایا تھا۔ اسے علامہ نے بڑا بنایا ہے۔ یہ دوسری قسم کا بڑا ہے۔ کوئی اسے شبیر شاہ کہتا ہے کوئی دبنگ شاہ کوئی دی گریٹ شاہ کوئی fanatic کوئی Fundamentalist- میں اسے کالا شاہ کہتا ہوں۔

اس مضمون میں میں کتاب کی بات نہیں کروں گا۔ صرف کالا شاہ کی بات کروں گا جو میری دانست میں ایک بڑا آدمیہ۔ کتاب کی بات اس لئے نہیں کروں گا کہ نہ میں عالم ہوں نہ ناقد۔ معافی چاہتا ہوں صاحبو رکی اور کتاب باتیں کرنا گوارا نہیں۔

کتادب کی بات صرف یہ کہ یہ کتاب کسی صحافی نے نہیں لکھی۔ ایک تخلیق کار نے اپنے مرشد کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

میں کالا شاہ سے ۱۹۵۱ء میں پنڈی میں متعارف ہوا۔ ان دنوں پنڈی یہ پنڈی نہ تھی جو آج ہے۔ سڑکوں پر تانگے چلتے تھے۔ اتنی پتلی تھی کہ ایک پختہ سڑک پر ہوتا دوسرا کچے پر۔ دھول اڑاتی رہتی تھی۔ راجہ بازار کے بیچ میں جہازی چار پائیاں بچھی ہوتیں جن پر راجے اور خان بیٹھ کے کباب کھاتے قہوہ پیتے اور حقے کے کش لگاتے۔ صدر میں ولایتی صاحب جا چکا تھا۔ دیسی صاحب چچے جما رہا تھا۔ خانساموں' بیروں' آئیوں اور میڈوں کی آوازیں گونجتی تھیں۔

صدر میں اک آدھ سینما ہاؤس تھا جس کے پاس ایک چھوٹا سا ہوٹل ووگی تھا۔ جہاں سے ادیبوں اور ریڈیو صداکاروں کو ادھار پر چائے سادہ روٹی مل جاتی تھی۔ اور انہیں ہوٹل میں بیٹھ کر گھنٹوں ادب اور حالات حاضرہ پر بحث اور خوش گپیاں کرنے کی کھلی اجازت تھی۔

ایک روز میں ووگی سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے عین درمیان میں ایک شخص کھڑا چند دانشوروں کو با آواز بلند ڈانٹ رہا ہے اور دانش وریوں سہمے ہوئے کھڑے ہیں۔ جیسے بالشٹے ہوں۔

ارے یہ کون گلیور ہے جس دانشوروں کو ڈانٹنے کی ہمت رکھتا ہے۔ میرے ساتھی نے کہا' یہ بڑی شے ہے۔ اسے کالا شاہ کہتے ہیں۔ جب یہ بولتا ہے تو سبھی چپ ہو جاتے ہیں۔

پھر یک روز یہ گلیور ووگی کے اندر آ گھسا۔ یوں جیسے ہاتھی چینی کی دکان میں آ گیا۔

بولا۔ ''ادب کے اجارہ دارو! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ قوم کو لوریاں دے دے کے سلا رہے ہو۔ اونہو! تمہارا کام سلانا نہیں جاگنا ہے۔ انہیں جگاؤ۔ عمل پر ابھارو' قوم کی تقدیر کو بدل دو۔''

وہ دیر تک بڑے جوش و خروش سے بولتا رہا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے ساتھی ادیبوں سے پوچھا۔ ''تم اس کی ڈانٹ کیوں سہ جاتے ہو؟''

ایک بولا۔ ''یہ بڑی رونت سے ڈانٹتا ہے اور بڑی بھیگ سے پیار کرتا ہے۔''

دوسرے کہنے لگے۔ ''عجیب آدمی ہے۔ بیک وقت آگ بھی ہے پانی بھی۔''

تیسرا بولا۔ ''بیک وقت دیوانہ بھی ہے فرزانہ بھی۔

''کوئی اسے جواب کیوں نہیں دیتا۔'' میں پوچھا ہوں۔

''یہ سچ بولتا ہے۔ سچ کے جواب میں کون بولے۔ کیا بولے۔''

''کرتا کیا ہے؟''

''صحافی ہے''

''میں نہیں مانتا۔'' میں چلایا۔ ''صحافی تو تماش بین ہوتا ہے۔ مشنری نہیں ہوتا۔ منہ زبانی ہوتا ہے' عملی نہیں ہوتا۔ بحثی ہوتا ہے' دو ٹوک نہیں ہوتا۔ نہیں یہ صحافی نہیں وسکتا۔''

پھر یہ مجاہد ہمارے دفتر میں آ گیا۔

آتے ہی بولا۔ ''بھولے بادشاہو! کیا تم سمجھتے ہو کہ جائیلیں چلا چلا کر تم کشمیر کو آزاد کرا لو گے۔ نہیں شہزادو! کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے مجاہد بننا ہوگا۔ یہ فائیلوں کا کام نہیں۔ عمل کا کام ہے۔ اٹھو باہر نکلو۔ لوگوں سے ملو۔ وہ مسلمان تو پہلے سے ہی ہیں۔ ذرا گیلے ہو کر پھس ہو گئے ہیں۔ ان میں کڑک نہیں رہی۔ ان میں کڑک پیدا کرو''

''خاکسار۔۔۔۔۔؟'' دفعتاً میرے ذہن کی باتیں مائنڈ نہ کرو۔ ہی از میڈ۔''

دوسرا بولا۔ ''بھئی یہ ساہ تو خاکسار ہے۔''

یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ بہت پہلے کی۔

ان دونوں کی جب میں نے عزیزوں کی اجازت لئے بغیر برادری کی مرضی کے خلاف محلے کی ایک خاتون سے شادی کر لی تھی۔ مجھ پر اغوا کا مقدمہ چل رہا تھا۔ دراصل مین نے نہیں خاتون نے مجھے اغوا کیا تھا۔ برادری والے لاٹھیاں اٹھائے میری تلاش میں تھے۔ میں خوف زدہ تھا۔ ڈرتا تھا کہ کسی کو پتہ چل جائے کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ صبح نوکری پر جاتا تھا۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا۔ شام کے اندھیرے میں گھر لوٹتا تھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ کسی کو میرے گھر کا پتہ نہ چل جائے۔

ایک شام گھر پہنچا تو دروازے پر ایک خاکی وردی والا کھڑا تھا۔ میں ڈر گیا۔ شاید مخبر ہو۔

اس نے بڑھ کر مجھے سلوٹ مارا۔ مجھے حوصلہ ہوا۔

''آپ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں خاکسار ہوں'' وہ بولا۔

''یہاں کیا کر رہے ہیں۔''

''یہاں ڈیوٹی پر ہوں۔''

پوچھا ''کیسی ڈیوٹی؟''

بولا۔ ''پتہ نہیں ہیڈ آفس سے آرڈر ملا ہے کہ ادھر ڈیوٹی دو۔ آپ ہیڈ آفس سے پوچھ لیں۔''

ہیڈ آفس قریب ہی تھا۔

وہ بولے۔ ''ہم خاکسار ہیں۔ ہمارا کام لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ ہمیں رپوٹ ملی ہے کہ آپ کی گھر والی بیمار ہے' بچہ ہونے وال ہے اور آپ سارا دن نوکری پر رہتے ہیں۔ بی بی گھر پر اکیلی رہتی ہے' کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں۔ اس لئے ہم نے آپ کے گھر ڈیوٹی لگا دی ہے کہ جب آپ گھر پر نہ ہوں بی بی کو مدد کی ضرورت ہو۔ دوا لانی ہو۔ ڈاکٹر کو بلانا ہو۔ ہسپتال جانا ہو تو ڈیوٹی گارڈ کو بول دیں۔''

حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ کیسی تنظیم ہے۔ جس کا مقصد لوث خدمت کرنا ہے۔

پھر تقسیم کے بعد مجھے ایک اور خاکسار ملا۔

وہ مری کا ایک بزرگ تھا۔ خواجہ جان محمد۔ کیونکہ وہ نقش بندی تھا اس لئے ہم اسے بھائی جان کہتے تھے۔

بھائی جان سے ملنے سے پہلے میں ایک خالص دانشور تھا۔ سولہ آنے دانشور۔ میرا رخ مغرب کی طرف تھا۔

بھائی جان نے میری گردن موڑ کر میرا رخ مشرق کی طرف کر دیا۔ سارا منظر ہی بدل گیا۔ دنیا ہی بدل گئی۔ میں نے پوچھا ''بھائی جان یہ کیا کیا؟''

بولے۔ ''کچھ بھی تو نہیں کیا آپ گاڑی ایک پہیے پر چلتی رہی تھی۔ ہم نے دوسرا پہیہ لگا دیا ہے اب یہ بہتر چلے گی۔

میں نے کہا آپ ''آپ میرے محسن ہیں۔''

بولے "نہیں محسن نہیں ہم تو خاکسار ہیں۔ ہمارا مقصد دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔"

مٹن نے کہا "بھائی جان خاکسار تحریک تو مدت سے ختم ہوچکی۔"

بولے "نہیں جو ایک بار خاکسار بن گیا وہ تادم زیست خاکسار رہے گا۔"

بھائی جان! آج کل تو میں میں کا دور ہے۔" میں نے کہا۔

بولے۔"جو ایک بار میں کے آلنے سے گر گیا وہ دوبارہ آلنے میں نہیں جاسکتا۔"

صاحبو! خاکسار تحریک کا بانی علامہ مشرقی صرف سائنس دان ہی نہیں تھا وہ جادوگر بھی تھا۔

اس نے کالاشاہ تخلیق کیا۔ خواجہ جان محمد تخلیق کیا۔ اور ہزاروں افراد کو میں کے آرام وہ گھونسلے سے نکال کر تو کے کشٹ خانے مین ڈال دیا۔

علامہ مشرقی سائنس دان تھا' حسابی تھا' سچا تھا' مجاہد تھا' پاگل تھا اور ایک عظیم آرگنائزر تھا۔ پتہ نہیں کیا کیا تھا۔

اگر وہ صرف حسابی سائنس دان ہوتا اور حکمرانوں کے منصوبوں کو بڑھاوا دینے کی چاکری قبول کر لیتا تو حکمران اسے اونچا منصب عطا کر کے اپنے خصوصی حلقوں میں شامل کر لیتے۔

لیکن اس کا میں کی نفی کرنا یہ نا قابل برداشت جرم تھا۔ اسالئے میں ایک گھوڑوں پر سوار حاکموں نے کہا۔

Nip the evil in the bud.

اوراٹ واز نپڈ ان دی بڈ۔ معافی چاہتا ہوں مجھے شاہ صاحب کے جملے

The dis-honoured genius.

سے اتفاق نہیں۔ علامہ کی عظمت کو حکمرانوں نے بھی تسلیم کیا۔ عوام کے رنگ میں آج بھی رنگے ہوئے ہیں۔ صوفی کہتے ہیں۔

ایسا رنگ دے رنگ نہ چھوٹے

دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا

میں شاہ جی سے پوچھتا ہوں۔ شاہ جی مجھے بتائے کیا دھبیوں نے بار ہا آپ کو پتھروں پر نہیں ٹپکا۔ کیا آپ کو بار ہا بھٹی نہیں چڑھایا گیا۔ کیا علامہ کا رنگ چھٹا ہے۔ پھر آپ اسے Dis-honoured genius کیسے کہہ سکتے ہیں۔

ذرا اس ہال کو دیکھئے۔ یہ جو اتنے سارے بڑے بڑے لوگوں اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ کیا وہ Disowned genius ہے۔

صاحبو! یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات تو کالا شاہ کی ہو رہی تھی۔ چلئے بھری محفل مین یہ راز بھی کھول ہی دوں کہ میں شاہ کو کالا کیوں کہتا ہوں۔

کالا شاہ دو آتشہ نام ہیں۔ کالے کو اللہ نے بڑی قوت عطا فرمائی ہے۔ سہ جانے قوت۔ مر مر کر جئے جانے کی قوت۔ مارنے کی قوت کی نسبت سہ جانے کی قوت افضل تر ہے۔ اس میں Survival کا راز ہے۔ کالا Survive کرے گا۔ عورت Survival کرے گی۔ یہی منشاء ایزدی ہے۔

شاہ کا لفظ شجرہ نسب کے حوالے سے نہیں۔ لیڈر شپ کے حوالے سے ہے۔ شخصیت کے حوالے سے ہے۔ سردار Personalty کالا شاہ۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کیا یہ موزوں ترین نام نہیں۔ پھر راولپنڈی دارالخلافہ بن گیا۔ یہاں بڑے بڑے افسر آ گئے۔ کالا شاہ کا ڈانٹنے کا حلقہ وسیع ہو گیا۔ ساتھ ہی برے برے صحافی بھی آ گئے۔ ان کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔ صحافت میں مجاہد کا کیا کام۔

ایک دن شاہ مجھ پر برس پڑا۔

''تم اپنے صاحب کو کیوں نہیں سمجھاتے''

ان دنوں مین سیکٹری ٹو پریذیڈنٹ کا او ایس ڈی تھا۔ کہنے لگا۔ ''تیرا باس ایک سچا مسلمان ہے۔ سچا انسان ہے۔ زیرک ہے۔ ہمدرد ہے۔ بات سنتا ہے سمجھتا ہے۔ اسے پتہ ہے کہ بڑی طاقتیں نہیں چاہتیں کہ وہ صدر ایوب کے قریب رہے۔ وہ اسے کھڈے لین لگا دیں گے''

''پھر!'' میں نے پوچھا۔

بولا۔ ''میں اسے بار ہا سمجھایا ہے کہ اپنا تحفظ کرلے۔ بار ہا سمجھایا کہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا۔ لیکن وہ اپنے تحفظ کے لئے کچھ نہیں کر رہا۔''

جب شہاب کو ہالینڈ کے کھڈے میں جھونک دیا گیا تو شاہ چیختا چلاتا ہوا میرے پاس آیا' بولا۔ ''وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اب ہمیں ایسا مسلمان کہاں ملے گا؟''

میں نے کہا۔شاہ جی ! یہاں ہر شخص کو اپنے سچے دین کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔شہاب نے ایک قسط میں ادا کردی۔آپ زندگی بھر قسطوں میں ادا کرتے رہیں گے۔"

صاحبو دعا کرو یہاں کوئی بڑا آدمی پیدا نہ ہو۔ جتنے بھی ہوئے ہم نے انہیں جینے نہ دیا۔صرف اس لئے کہ وہ بڑے تھے۔ اس ٹھگنوں کی بستی میں کسی کا بڑا ہونا برداشت نہیں کیا جاتا۔

چودھری

(برکت علی)

اس زمانے میں میں سکول ماسٹر تھا۔پہلی بار میں نے اسے سکول میں دیکھا تو خاص توجہ نہ کی۔ادھیڑ عمر کے باوجود ایک مستعد سیلز مین تھا۔سکول میں پبلشرز آتے رہتے تھے۔بڑے مودب مہذب۔جی جناب۔جناب عالی۔لیکن اس کا انداز منفرد تھا۔نہ جی جناب' نہ لیس سر' جناب والا' آتے ہی بے تکلفانہ بات چھیڑ کر اپنے گرد جمگھٹا لگا لیتا۔پھر اس کے قہقہے گونجتے۔

مجھے پبلشروں سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔اگرچہ میرے مالی حالات بہت خراب تھے۔تنخواہ قلیل تھی۔گھر میں افراد زیادہ تھے۔قرض پر گزار بسر ہو رہا تھا۔لیکن یہ بات کبھی نہ سوجھی تھی کہ پبلشر سے مالی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دوسری دفعہ وہ مدرسے میں آیا تو تفریح کا وقت تھا۔اساتذہ سٹاف روم میں بیٹھے تھے۔اس نے آتے ہی حسب دستور سٹاف کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔یہ دیکھ کر میں سٹاف روم سے باہر نکل گیا۔اور میدان میں ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔کچھ دیر کے بعد میں نے سر اٹھا تو وہ میرے روبرو کھڑا تھا۔اسلام علیکم کہہ کر وہ میرے پاس آ بیٹھا۔

تمہارا نام کیا ہے۔اس نے مجھ سے یوں پوچھا جیسے میں سینئر انگلش ٹیچر نہیں بلکہ طالب علم ہوں۔

مجھے اس کی بے تکلفی اچھی نہ لگی لیکن اس زمانے میں میں بری طرح سے احساس کمتری کا شکار تھی۔میرا نام ممتاز حسین ہے۔میں نے کہا جواب دیا۔

ان دنوں میرا نام سکول میں ممتاز حسین تھا کہ میں ممتاز مفتی کے نام سے ادبی جریدوں میں لکھتا ہوں۔یہ بات میں نے التزاماً چھپائے رکھی تھی۔میرے ساتھی اساتذہ رسمی اخلاق کے دیوانے تھے۔میری تحریریں نفسیات اور جنسیات کا زاویہ لئے ہوئے تھیں۔یہ زاویہ نظر ان دنوں ممنوع تھا۔دراصل سکول کی ملازمت کے ابتدائی دور میں ہی مجھے یہ احساس ہو چکا تھا کہ میرے خیالات میرے ساتھی اساتذہ کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔انہی دنوں از راہ اتفاق میری ایک تحریر ہمارے سٹاف کے ایک ممبر کے ہاتھ آ گئی۔وہ اس جریدے کو سٹاف روم میں لے آیا اور سب کو مخاطب کر کے میرے افسانے پر تنقید کرنے لگا۔افسانے کے اقتباسات

سن کر جملہ اساتذہ نے لاحول پڑھا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ کہنے لگے کہیں یہ ماسٹر پیس آپ کی تصنیف تو نہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ مطمئن ہو گئے پھر مجھ سے کہنے لگے۔ادب کے نام پر ایسی اخلاق سوز باتیں لکھنا' کس قدر افسوس ناک ہے' کیوں ممتاز صاحب۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر کہ دوں کہ ہاں یہ افسانہ میں نے لکھا ہے۔آپ جو اسے اخلاق سوز سمجھ رہے ہیں۔ یہ آپ کے ذہنی وسعت کا فقدان ہے۔لیکین مجھ مین جرات نہ پڑی اور مین نے جواب میں سر اثبات میں ہلا دیا آپ بجا فرماتے ہیں۔

اس روز میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مدرسے میں اپنی تصانیف کو نہیں اپناؤں گا۔

کب سے سکول میں ملازمت کر رہے ہو۔ چودھری نے پوچھا۔

چھ سات سال ہوئے میں نے جواب دیا۔

پھر میں نے اپنا تعارف کرانا شروع کیا۔ کہنے لگا میرا نام چوہدری برکت علی ہے۔ میں پنجاب بک ڈپو کا مالک ہوں ہم درسی کتابیں چھاپتے ہیں۔

سوداٹ؟ میں نے سوچا چھاپتے ہیں تو بڑے چھاپو۔لیکن اخلاقاً باآواز بلند کہا۔ بہت خوب اور پھر خاموش ہو گیا۔ چند ایک منٹ کے لئے خاموشی طاری رہی۔ پھر دفعتاً وہ جوش میں آگیا بولا میں تمہیں ایک آفر دینا چاہتا ہوں۔

تو مجھے کیا آفر دے گا میں نے سوچا۔

ہم کورسز کے علاوہ ہیلپ بک بھی چھاپتے ہیں۔ وہ بولا۔تم مجھے میٹریکولیشن کے لئے ایک ٹرانس لیشن گائڈ لکھ دو۔ میں تمہیں تمہاری تین سال کی تنخواہ کے برابر معاوضہ دوں گا۔آج ہی مجھ سے معاہدہ کر لو۔ آدھی رقم ابھی ادا کروں گا۔آدھی چھ مہینے کے بعد جب تم مجھے مسودہ دو گے۔

پتہ نہیں ان دنوں میری نفسیات کس سانچے میں ڈھلی تھی کہ تین سال کی تنخواہ مجھ میں کوئی تحریک پیدا نہ کر سکی میں نے کہا۔

چودھری صاحب آپ کی بڑی نوازش ہے لیکن مجھے درسی کتاب لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

غصے سے اس کا منہ لال ہو گیا۔ بولا تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے مسٹر۔

کچھ کہنے کی غرض سے میں نے کہا۔ آپ کسی اور ٹیچر سے کیوں نہیں لکھوا لیتے۔

میں نے اس قسم کی آفر اور کسی کو نہیں دی۔ اس نے مجھے ڈانٹا۔

چودھری جی میں نے کہا آخر مجھ میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ یہ کتاب مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔

وہ رک گیا کہنے لگا ہم درسی کتابوں کے پبلشرز بڑے ''ول انفارمڈ'' ہوتے ہیں۔ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ کون سی ہیلپ بک کس سے لکھوائی ہے۔ مگر کیا سمجھو گے۔ تمہارا ذہن ہی ٹھیک نہیں یہ کہ کر وہ چلا گیا۔

تین مہینے کے بعد وہ پھر آیا۔ بغیر کسی تمہید کے اس نے حکم چلایا۔ تم فارغ ہو تو میرے ساتھ چلو۔

اس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ لیکن اس بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے چل دیا۔ سوچ رہا تھا۔ یہ کیسا پبلشر ہے۔ منہ میں جو بات آئے کہہ دیتا ہے ذرا نہیں جھجکتا۔ طبیعت کا جاٹ ہے۔ انداز تکلم جرنیلی ہے۔ بات بات پر ڈانٹتا ہے۔ بات بات پر قہقہے مارتا ہے۔ بات کا کڑوا ہے لیکن ساتھ ہی بات سے سچائی اور خلوص کی بو آتی ہے۔

ایک ہوٹل پر جا کر وہ رک گیا۔ بولا مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے طعام پھر کلام۔

ان دنوں میں نفسیات کے مطالعے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کس نے کہا تھا کہ کسی کی شخصیت کو جاننا چاہو تو اسے کھاتے ہوئے دیکھو۔

میں چودھری برکت علی کو کھوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ بڑی تکلفی اور اشتیاق سے کھا رہا تھا۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ ٹیبل میز سے بے نیاز کوئی دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے' اچھا جانے یا بڑا اسو واٹ۔

خود کھانے کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بھی کھلا رہا تھا۔ یہ کھاؤ۔ یہ عمدہ ہے۔ یہ اچھا نہیں یار تم کیسے انسان ہو۔ نہ تمہیں بات کرنی آتی ہے نہ کھانا آتا ہے نہ پینا آتا ہے اور نہ پیسا کمانا آتا ہے۔

خود کھانے سے فارغ ہو کر اس نے بڑے سرسری انداز میں کہا' اچھا تو ممتاز مفتی آج تک تم نے کتنے افسانے لکھے ہیں۔

اچانک سوال پر میں گھبرا گیا۔

''اب آئیں آئیں شائیں نہ کرنا'' اس نے مجھے ڈانٹا۔ میں نے شاھد احمد اڈیٹر ساقی سے تحقیق کر لی ہے تمہارے گیارہ افسانے میں نے حاصل کر لئے ہیں۔ سات افسانے تم دے دو۔ ہم تمہارا مجموعہ چھاپیں گے۔

اس کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

کہنے لگا۔ ہم نے ایک ذیلی ادارہ بنایا ہوا ہے جو ادبی کتابیں چھاپتا ہے۔ مگر غلط فہمی نہ رہنا تمہیں ادبی کتاب کے تمہیں صرف

ڈھائی تین سو روپے ملیں گے اس سے زیادہ نہیں۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔

اور وہاں وقفے کے بعد وہ پھر بولا۔گھبراؤ نہیں۔ہم کسی کو نہیں بتائیں گے کہ تم ممتاز مفتی ہو۔تمہیں نہیں معلوم پبلشر پر پردا رکھنا جانتے ہیں۔پردہ رکھنا ان کا کام ہے پردہ اٹھانا نہیں۔

ٹھیک ہے تمہارا چاؤ پورا ہو جائے گا۔اس نے پھر مجھے ڈانٹا۔لیکن تم احمق ہو وہ بولا۔اگر تم ٹرانسلیشن گائیڈ لکھ دو تو تمہیں دو ڈھائی ہزار مل جائیں گے۔

دفعتاً اس سوجھی بولا چلو ہماری آفراب بھی سٹینڈ کرتی ہے۔تم اپنا شوق پورا کرلو ہم تمہاری کتاب چھاپتے ہیں' جب تک تم ہماری ٹرانسلیشن گائیڈ لکھ دو۔بولو منظور ہے؟ چند ایک ساعت کے لئے وہ میری جانب دیکھتا رہا۔پھر غصے سے میز پر مکا مار کر بولا۔تم بد نصیب ہو۔ناؤ دی افراز کلوزڈ۔

چھ مہینے کے بعد اس کا خط موصول ہوا۔لکھا تھا کتاب چھپ گئی ہے۔فوراً لاہور پہنچو۔

لاہور پہنچا تو "ان کہی" چھپی تھی لاحول ولا۔کیا بیہودہ نام ہے چودھری برکت علی نے ناک چڑھا کر کہا۔اس نام سٹال ویلیو نہیں۔لیکن تمہیں کچھ پتا بھی ہو۔خیر تم اپنی رائلٹی لو۔اور مزے کرو۔دس فیصد کے حساب سے تین سو روپیہ بنتا ہے پھر وہ دفعتاً رک گیا۔بولا ممتاز مفتی یہ بتا کیا کوئی ایسی چیز ہے جسے خریدنے کو تیرا دل چاہتا ہو۔

اس زمانے میں میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ ریڈیو خریدوں۔لیکن ان دنوں ریڈیو بہت قیمتی تھے۔میری توفیق نہ تھی اس لئے اس آرزو کے پورے ہونے کا امکان نہ تھا۔

میں نے ادبی زبان سے کہا چودھری ریڈیو خریدنے کو جی چاہتا ہے لیکن اس نے مجھے جملہ مکمل کرنے نہ دیا۔میری بانہ پکڑی گھسیٹ کر دوکان سے باہر لے گیا۔ایک تانگے میں بیٹھا کر وہ مجھے حال روڈ لے گیا۔وہاں دو ایک دوکانوں میں گیا۔مختلف ریڈیو دیکھے ان کی قیمتیں پوچھیں۔چار پانچ سو سے کم کا کوئی ریڈیو نہ تھا۔آخر میں اس نے ایک ریڈیو پسند کرلیا۔اس کا نام ایکو تھا۔قیمت ساڑھے سات سو روپے تھی۔اس نے وہ ریڈیو پیک کروکر تانگے پر رکھا۔بولا بیٹھ جا سیدھا سٹیشن پر جانا۔ایک گھنٹے کے بعد تیری گاڑی جائے گا۔ان دنوں میں قصور کے گورمنٹ ہائی سکول میں پڑھاتا تھا۔

اس پر میں نے احتجاج کیا۔میں نے کہا چودھری میں تیرا قرض کیسے ادا کروں گا۔

کوئی قرض ورض نہیں وہ چلایا۔ میری طرف سے تحفہ ہے۔ جا اب۔ دیکھو اسے خیال سے ساتھ لے جانا۔ توڑ پھوڑ دیا تو میں مرمت کروا کر نہیں دوں گا۔ اوپر تختے پر نہ رکھنا۔ اپنے پاس سیٹ پر رکھنا۔

راستے میں میں سوچتا رہا یا اللہ یہ کیسی مخلوق ہے۔ یہ تو سچ کا چودھری ہے۔ ایک طرف سے ریچھ ہے۔ دوسری طرف سے فاختہ انسان کوئی شخصیت سے میرا اسارا علم خس وخشاک بن کر زمین پر بکھرا ہوا تھا۔

اس کے بعد ہم دوست بن گئے۔ لیکن نہیں یہ تعلق دوستی کا نہیں تھا۔ یہ عجیب سا تعلق تھا۔ جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اگرچہ وہ میرا ساتھ دیتا تھا۔ لیکن ساتھی نہیں تھا۔ بات بات پر ڈانٹتا تھا۔ لیکن بڑا بن کر نہیں اکثر مدد کرتا تھا۔ مگر مربی بن کر نہیں۔ اگر کسی بات پر یا رتم میں ممنوع احسان ہوتا۔ شکر گزاری کا اظہار کرتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس دیتا یار تم کتنے احمق ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں تم پر احسان نہیں دھر رہا۔ میں تو بزنس مین ہوں۔ حساب کتاب کا کچا نہیں ہوں میں تم پر انوسٹ کر رہا ہوں۔

چودھری برکت علی ایک قابل بزنس مین تھا۔ اصراف کا قائل نہ تھا۔ ہمیشہ دو اور دو چار گنتا رہتا تھا۔ لیکن وہ ایک عام بزنس مین نہیں تھا۔ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ انوسٹمنٹ کو بھی بزنس کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ چودھری برکت علی شخصیت اور کردار کے لحاظ سے بہت بڑا آدمی تھا حسابی اتنا کہ نالے کے کنارے رک کر سوچنا شروع کر سوچ میں پڑ جائے۔ غنی ایس کہ سوچ سمجھے بغیر دریا میں پھلانگ جائے۔ بگڑنے پر آئے تو چھوٹی سی بات پر بگڑ جائے درگزر کرنے کو آئے تو بڑی سے بڑی بات کو نظر انداز کر دے۔ چودھری برکت علی کی شخصیت مجموعہ اضداد تھی۔ لیکن اس مین منفی رعنصر نہ تھا۔ اسے مل کر پہلی بار میں شخصیت کے پیراڈاکس کا مفہوم سمجھا۔

اس کا برتاؤ صرف مجھ سے اس نوعیت کا نہ تھا۔ اس کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ سوشل نوعیت کے نہیں تھے۔ رکھ رکھاؤ کا وہ قائل ہی نہ تھا۔ داشتہ آید بکار کا اسے شعور نہ تھا دراصل اس کے اندر بڑی جان تھی۔ بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پبلشنگ کا کام اس کے اندر کی ''او دھ'' کو جذب نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے بہت سی مصروفیات پال رکھیں تھیں۔ پبلشروں کی ایک تنظیم بنا رکھی تھی۔ دو ایک ہائی سکول چلا رکھے تھے۔ پنجاب بک ڈپو کے علاوہ ادبی کتابیں نشر کرنے کا ایک ادارہ مکتبہ بنا رکھا تھا' جو اعلیٰ ادبی کتابیں چھاپنے کے لئے مشہور تھا۔ ایک ادبی ماہنامہ چلا رکھا تھا۔ ''ادب لطیف''

ان دنوں ادب لطیف چوٹی کا ادبی جریدہ سمجھا جاتا تھا۔ جسے چلانے کے لئے چودھری برکت علی نامور ادیبوں کا تعاون حاصل کیا کرتا تھا۔

چودھری برکت علی بہت بڑا بزنس ایگزیکٹو تھا۔ یہ قابلیت خداداد تھی۔ اتنی ساری مصروفیات بھی اس کی ایکسٹروورٹ صلاحیتوں کو جذب نہ کرسکتی تھیں۔

ان دنوں چودھری کے بہت سے نوجوان عزیز و اقربا۔ اس کے گرد آ جمع ہوئے تھے۔ نذیر تھا۔ رشید تھا۔ بشیر تھا۔ یہ نوجوان بڑے ذہین تھے۔ محنتی تھے۔ وہ برکت علی کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ ان میں کام کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ادب شناسی اور پرنٹنگ میں مہارت حاصل کرلی اور ادبی حلقوں پر چھا گئے۔

اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ شیخوپورہ کے ایک زرعی خاندان نے کس طرح اعلیٰ ادب اور کوالٹی پرنٹنگ پر عبور حاصل کرلیا اور لاہور میں پرنٹرز اور پبلشرز کے حلقوں میں ایک اونچا مقام حاصل کرلیا۔ بہرحال ایک بات واضح تھی کہ یہ سب دیئے چودھری برکت علی کے جلائے ہوئے تھے۔ ان باصلاحیت نوجوان چودھری میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ سب اوور امبیشس تھے۔ اور ''میں میں'' سے اس قدر سرشار تھے کہ مل کر کام نہ کرسکے۔ ورنہ آج چودھری خاندان کا مقام بہت بلند تر ہوتا۔

ایک دن چودھری برکت علی بڑی گہری سوچ میں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔ یہ تو غیر از معمولی بات ہے۔

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔

چودھری صاحب سوچ رہے تھے۔ غیر از معمولی بات ہے۔ ہے نا میں نے اسے چھیڑا۔

وہ بولا۔ مجھے سوچنے کی اجازت نہیں کیا۔

عمل کے متوالے سوچتے نہیں میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ اچھا تو مجھے مشورہ دے۔ میں چاہتا ہوں کہ باری کچھ دیں۔

اس میں کیا مشکل ہے دینا ہے تو دے دو میں نے کہا۔

تم بھی نرے ادیب ہو اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ ممتاز مفتی دینے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ انداز ہوتا ہے یہ نہیں کہ دوسرے سے کہا۔ ہاتھ پھیلا اور دے دیا۔ یہ کہ کر وہ غصے میں اٹھ بیٹھا اور چلا گیا۔

باری ایک ادیب تھا۔ اس نے چودھری کے کہنے پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ''وہ کمپنی کی حکومت'' جسے مکتبہ اردو نے شائع کیا تھا۔ باری مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن تھا بڑا خوددار۔ چودھری پرنے کئی بار اسے کہا تھا۔ باری تو بہت نکما ہے۔ کچھ لکھ۔ پیسے کما۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے۔ خالی دانشورانہ باتیں کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن باری جملہ ادیبوں کی طرح خالی دانشورنہ باتیں کر

کہ گزر اوقات کر رہا تھا۔

دو ایک دن کے بعد چودھری نے مجھ سے کہا دیکھ مفتی باری کچھ نہیں لکھے گا۔ تو اسے کہہ کہ کمپنی کی حکومت پر نظر ثانی کر دے۔

بڑی مشکل سے باری نظرانی کرنے پر رضامند ہوا گیا۔

جب کتاب کی ریویژن مکمل ہوگئی تو باری مجھ سے کہنے لگا یار میں بھی احمق ہوں۔ جس کتاب کی تصنیف پر مجھے صرف تین سو روپے ملے تھے۔ اس پر نظر ثانی کے لئے زیادہ سے زیادہ سوڈیڑھ سول جائیں گے۔ خواہ مخواہ میں نے تین مہینے ضائع کئے۔

باری ایک چھوٹی سی نیم چھتی میں بیٹھا تھا۔ کمر میں کوئی سامان نہ تھا۔ صرف ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ کہنے لگا مفتی میری بہت بڑی آرزو تھی کہ یک مشت ایک ہزار روپیہ میرے ہاتھ آئے آج وہ پوری ہوئی ہے یہ کہہ کر اس نے ایک ایک روپے کے نوٹوں کے نو بنڈل کھولے پھر ان پرچیوں کو ہوا مین اڑانے لگا۔ اس روز وہ سارا دن ان پرچیوں سے کھیلتا رہا۔

اگلے روز میں چودھری کو بتایا تو قہقہہ مار کر ہنسنے کی بجائے فکر مند ہو گیا۔ کہنے لگا۔ کہنے لگا۔ اس روز وہ سارا دن ان پرچیوں سے کھیلتا رہا۔

اس کے ساتھ ہی چودھری کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا جو ادیب برکت علی کے اداروں میں کام کرتے تھے۔ انہیں باقاعدہ تنخواہ نہیں دی جاتی تھی کبھی پچاس روپے دے دئے جاتے کبھی پچیس اور کہہ دیا جاتا کہ باقی پھر سہی۔ اس باقی پھر سہی سے ادیب بہت تنگ ہوتے تھے۔

ان دنوں احمد راہی مکتبہ اردو میں کام کرتا تھا۔

ایک روز احمد راہی کہنے لگا یار مفتی آج میں چودھری نذیر کا اس چاقو سے پیٹ چاک کروں گا۔ تو یہاں بیٹھ جا اور دیکھتا رہ۔ وہ تماشا دکھاؤں گا کہ وہ یاد کرے گا۔

میں نے کہا بات کیا ہے۔

کہنے لگا میری دو مہینے کی تنخواہ دبا رکھی ہے۔ باقی پھر سہی کر کے۔ کل اس شخص نے جو کام کیا ہے مین اسے کبھی نہیں بخشوں گا۔ کل میں شہر سے باہر گیا تھا۔ پیچھے نے منڈی سے ایک عمدہ مچھلی خریدی اور میرے گھر چلا گیا۔ میری بیوی سے کہنے لگا۔ بھابھی آج راہی گھر پر نہیں تو سوچا بھابھی سے پوچھ آؤں کہ کوئی تکلف تو نہیں۔ کچھ منگوانا تو نہیں۔ راستے میں یہ مچھلی مجھے اچھی لگی۔ تو میں آپ کے لئے لے آیا ہوں۔

اب میری بیوی کہہ رہی ہے چودھری تو بہت اچھا آدمی ہے۔ ضرور تم نے اس رقم لے کر کھالی ہے اور اس پر الزام دھر رہے ہو کہ وہ تنخواہ نہیں دیتا۔

آج میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ احمد راہی نے منیر پر مکا مارا اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ احمد راہی خود قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ کہنے لگا یار کمال کی چالاکی کر دکھائی ہے چودھری نے لیکن آج میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔

حیرت کی بات تھی کہ کہیں تو ہزاروں روپوں کی رقم بے دریغ ادا کی جاتی تھی۔ اور کہیں معمولی رقم کی ادائیگی میں باقی پھر سہی کی کلی لگا دی جاتی۔

پھر یہ بھی ہوتا تھا کہ مہینے میں ایک یا دو بار منٹو مکتبہ اردو میں آبیٹھتا۔

چودھری نذیر بوتل منگا دو تقاضا کرتا۔ چودھری گھبرا جاتا تو منٹو چلاتا۔ اب ہچکچاتا کیوں ہے۔ ایک نہیں دو کہانیاں لکھ کر دے کر جاؤں گا۔ یہاں تیرے پاس بیٹھ کر لکھوں گا۔ لیکن دیکھ جانی دا کر لا نا ٹھہرانہ اٹھالانا۔ اور ادھا نہ ہو۔ چودھری نذیر گھبراتے گھبراتے ہچکچاتے ہچکچاتے مگر بڑے ادب سے وسکی خریدنے چل پڑتا۔

ادیبوں کی مانگیں طرح طرح کی ہوتی تھیں۔ منٹو دھونس سے مانگتا تھا۔ فکر تونسوی کی مانگ کبھی ہونٹوں تک نہ آئی تھی۔ صرف نگاہوں میں جھلکتی۔ اس میں بھی قیام پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی جلتی کبھی بجھ جاتی یونہی جلتی بجھتی رہتی۔

فکر تونسی کامی تھا۔ گونگا تھا۔ ادب کا دیوانہ تھا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں "رلنے" کے بعد کیسے چودھری کے پاس آ پہنچا تھا۔ چودھری بظاہر فکر کے ادارے میں فکر واحد کامی تھا۔ باقی سب منہ زبانی تھے۔ اور چودھری کامی کی بڑی قدر کرتا تھا۔ چونکہ سرمایہ دار ہونے کے باوجود بنیادی طور پر وہ خود شدت سے کامی تھا۔

تقسیم کے بعد پنجاب اور ہندوستان سے آنے والے ادیبوں کا تانتا لگ گیا۔ چودھری پر بہت بوجھ پڑ گیا۔ مہاجر ادیبوں کی مانگتی کا رنگ بدل گیا اور چودھری کی تلخ کلامی گویا چوگئی۔ حالات نے اسے ڈی سلف کر دیا۔

اس کے نوجوان عزیزوں نے پر پرزے نکال لئے۔ اور وہ علیحدگی پر ضد کرنے لگے۔ گودھری کا اپنا بیٹا باپ جیسی صلاحیتوں کا مالک نہ تھا۔ وہ چودھری کے کاروبار کو سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ چودھری کے اداروں میں کام کرنے والوں میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جو کاروبار کو سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ فودھری کے اداروں میں کام کرنے والوں میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جو کاروبار مین اس کا ساتھی بن سکتا تھا۔ چودھری کی بیٹی میں صلاحیت موجود تھی۔ لیکن اس کی شادی ایسی جگہ ہو گئی تھی جہاں افلونس نے اسے چاٹ لیا۔

مجھ سے چودھری کا مطالبہ تھا کہ میں نوکری چھوڑ کر اس کے ادارے میں کام کروں۔ مجھے علم تھا کہ کاروباری صلاحیت سے کورا ہوں۔اور عملی طور پر نکمہ ہوں اس لئے میں نے اس کی پیشکش کو منظور کیا۔ پھر میں تلاش معاش میں راولپنڈی آ گیا اور ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔رابطہ ٹوٹنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں چودھری سے شرمندہ تھا۔اس نے بار بار جگہ جگہ میرا ساتھ دیا تھا لیکن میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکا تھا۔ایک بات یقینی ہے کہ چودھری برکت علی ساتھ نہ دیتا تو ممتاز مفتی سوکھ کر بکھر جاتا اور آج اس نام سے کوئی واقف نہ ہوتا۔

◆◆◆

بیراگی

(طفیل نیازی)

غالباً کی بات ہے جب میں نے پہلی مرتبہ طفیل نیازی کو سنا۔

میں ایک قلم مزدور ہوں۔ مجھے بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے کچھ ہانڈی روٹی کے لئے کچھ ذہنی عیاشی کے لئے۔ ان دنوں میری عادت تھی کہ ریکارڈ پر کوئی ٹیپ لگا لیتا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ موسیقی کے زور پر لکھتا رہتا۔ اس سے یہ انداز اور پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ موسیقی کے زور پر لکھتا رہتا۔ اس سے یہ انداز نہ لگائیے گا کہ میں موسیقی سننا جانتا ہوں یہ بات نہیں البتہ موسیقی سے شدت کے ساتھ متاثر ضرور ہوتا ہوں۔

ایک روز میرے بیٹے عکسی نے مجھے ایک ٹیپ دیا کہنے لگا ابو یہ ٹیپ سنئے۔ ٹیپ لگا کر میں لکھنے لگا۔ لکھتے لکھتے دفعتاً میں چونکا ارے مجھے ایسے لگا جیسے کوئی مظلوم دکھی حبشی کراہ رہا ہو۔ پکار رہا ہو۔

گیت کے بول بھی عجیب تھے۔

''بول مٹی دیا باویا وے تیرے دکھاں نے مار مکا لیا

وے میرا سانول ماہی آجا ہو۔ او۔ او۔ آجا ہو۔ او۔ او''

مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ۔

''بول اے مٹی کے بنے ہوئے پتلے۔ یہ تو نے کیا کیا کہ اپنی زندگی کے معملات کو اپنے ہاتھوں الجھا کر خود کو دکھی بنا لیا۔ تیرا دکھ ہم سے دیکھا نہیں جاتا بول ہمارے پیارے ماہی بول یہ تو نے کیا کیا؟ چھوڑ ان الجھنوں کو۔ ہمارے دوار پر آ کھڑا ہوا۔

یہ طفیل نیازی کی آواز تھی اور اس روز میں نے طفیل کی دھن اور بولوں میں بلا کی ہم آہنگی محسوس کی۔ اس ہم آہنگی نے میرے اندر ایک کیفیت پیدا کر دی۔ ایک سرشاری۔ یوں جیسے مٹی کا باوا کسی کے دوارے پر کھڑا ہاڑے کر رہا ہو۔

صرف ایک گیت کی بات نہیں۔ اس ٹیپ میں طفیل کے بیشتر گیتوں کا رنگ تاثر بھرا تھا زخمی پرندے تھے دھن دکھ میں بھیگی ہوئی

تھی مثلاً ایک گیت کے بول تھے۔

درداں مارلیا وے میرا دل ڈردانہ بولے

ایک کا مکھڑا تھا

سجناں وچھوڑا تیرا جند نہ سہاردی

سارے ٹیپ میں ایسے ہی گیت بھرے ہوئے ہیں۔ یہ ٹیپ کسی ادارے نے پروڈیوس نہیں کیا تھا۔ ادارے جب بھی کوئی گانا پروڈیوس کرتے ہیں تو اسے بنا سجا دیتے ہیں۔ چیز اور بنی سجی چیز میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے جنگل اور باغیچوں میں فرق ہوتا ہے۔ عام طور پر بنے سجے گیت محفل کے لئے ہوتے ہیں اکیلے کے لئے نہیں۔ موسیقی اکیلے پر اور اثر نہیں رکھتی ہے محفل پر اور۔ نفسیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ انسان ازلی طور پر اکیلا ہوتا ہے۔ باہر کا انسان اس اکیلے پن سے خائف ہے اور اس خوف سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے گرد بھیڑ لگائے رکھتا ہے۔

طفیل کا وہ ٹیپ خانہ ساز ٹیپ تھا اسے کسی نے بنایا سنورا نہ تھا اس میں نمائش کا عنصر نہ تھا۔ طفیل کے اندر کا حبشی گا رہا تھا میں اکیلے میں سن رہا تھا میرے اندر کا انسان میرے سامنے آ بیٹھا تھا۔

طفیل کے ان گیتوں نے مجھ میں تخلیق کی تحریک پیدا کی۔

مسلسل پانچ سال تک طفیل کے گیت مجھ میں تخلیق کی تحریک پیدا کرتے رہے۔ طفیل میرا محسن بن گیا۔ چند سال کے بعد طفیل راولپنڈی آ گیا۔ میں بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے گیا مگر دیکھ کر بہت مایوس ہوا میرے روبرو وہ طفیل نہیں تھا۔ جو مجھ سے پوچھا کرتا تھا کہ بول مٹی دیا باویا۔ اس طفیل میں تڑپ نہ تھی' پکار نہ تھی۔ تلخی نہ تھی دکھ نہ تھا یہ طفیل ایک عام انسان تھا اس میں مٹھاس تھی عجز تھا۔ رواداری تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ طفیل کدھر گیا جو ٹیپ میں کراہتا تھا' پکارتا تھا' بین کرتا تھا۔

ظاہر تھا کہ طفیل ایک منفرد فن کار ہے اس نے یہ انفرادیت کیسے حاصل کی۔ میرے اندر تجسس کا جذبہ پیدا ہو گیا کہ اس گلوکار کے اندر دکھ کے اظہار کی صلاحیت کیسے پیدا ہوئی مجھے طفیل کی زندگی سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔

طفیل شام چوراسی سے ایک میل دور مڈیراں گاؤں میں پیدا ہوا' شام چوراسی پنجاب کا ایک قصبہ ہے جو گائیکی کے ایک بڑے گھرانے کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہمارے کئی ایک معروف گوئے شام چوراسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

''مڈیراں'' سکھوں کا ایک گاؤں تھا جہاں طفیل کا گھرانا مسلمانوں کا واحد گھرانا تھا۔ یہ گھرانا پکھاوج کا گھرانا تھا۔ طفیل کے

آباواجداد بڑے بڑے پکھاوجیۓ تھے۔وہ کھلے ہاتھ کا طبلہ بجانے میں ماہر تھے۔یہ جن تال کا جن ہے۔

طفیل نیازی پاکستان کے مشہور معروف پنجابی لوک گائیک ہیں۔

وہ آج تک تقریباً چار ہزار گانے ریکارڈ کرا چکے ہیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن کا افتتاح ہوا تھا تو طفیل نیازی نے موسیقی کا پہلا پروگرام پیش کیا تھا۔

پی ٹی وی کے مشہور پروگرام لوک تماشہ میں جو تین چار سال تک چلتا رہا تھا' طفیل نیازی نے بطور کمپوزر اور گلوکار بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

طفیل نیازی گزشتہ چودہ سال سے وزارت ثقافت کے محکمے لوک ورثہ سے منسلک ہے۔

طفیل نیازی نے بہت سے غیر ممالک کے دورے کئے ہیں مثلاً امریکہ' برطانیہ' کنیا' یوگنڈا' ماریشس اور بھارت جہاں انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

بھارت میں طفیل نیازی کے فن کو بہت سراہا گیا۔وہاں انہوں نے بہت سے ایوارڈ حاصل کئے جن میں امیر خسرو ایوارڈ' کے ایل سہگل ایوارڈ' بیجو باورا ایوارڈ' سرسوتی ایوارڈ' بابا گرونانک ایوارڈ' اور امیر خان ایوارڈ شامل ہیں۔

۱۹۸۳ء میں صدر پاکستان نے طفیل نیازی کو حسن کارکردگی کا اعزاز دیا تھا۔بچپن سے ہی طفیل کے کان میں سر اور تال کی آوازیں پڑتی رہیں۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گانے کو گلے سے تعلق ہے۔یہ خیال درست نہیں۔بنیادی طور پر گانے کو کان سے تعلق ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ ہم ایک جیسا نہیں سنتے۔کچھ لوگ زیادہ سنتے ہیں اور کچھ لوگ کم۔کچھ لوگوں میں سنی ہوئی چیز کو یاد رکھ لینے کی صلاحیت ہوتی ہے ایسے لوگ گائیک بننے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔

جب طفیل بڑا ہوا تو اسے سکول میں داخل کر دیا گیا سکول کا ہیڈ ماسٹر سرکار سیا تھا۔جب اس نے طفیل کو دعا گاتے ہوئے سنا تو اس کی توجہ طفیل پر مرکوز ہوگئی وہ اسے گانے کی ترغیب دینے لگا اور زیادہ تر وقت اس گانا سننے میں صرف کرنے لگا۔نتیجہ یہ ہوا کہ طفیل کی توجہ پڑھنے کی بجائے گانے کی طرف لگ گئی اور اس نے گھر کے خلاف بغاوت کر دی گھر والے چاہتے تھے کہ وہ پکھاوجیہ بنے لیکن اس کے سر پر سر کی لگن سوار تھی۔

موسیقی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔لسر اور تال' تال جسم پر اثر کرتی ہے' سر روح پر۔تال پر ہاتھ چلتا ہے۔پاؤں چلتے ہیں۔رقص

چلتا ہے۔ سارا جسم چلتا ہے۔ سر روح کی تاروں کو چھیڑتی ہے۔ دکھ ابھرتا ہے درد جاگتا ہے اندر کا انسان باہر نکلتا ہے۔ کائنات سے ایک ان جانا تعلق بیدارت ہو جاتا ہے۔ پھر سب کچھ ایک ہو جاتا ہے۔

فنکار خدو رو ہوتا ہے۔ گملے کا بوٹا نہیں ہوتا۔ وہ ٹیڑی لکیر ہوتا ہے سیدھا کرو تو ٹوٹ جاتا ہے۔ نپے تلے راستے پر نہیں چلتا۔ اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ شعور کے جاگنے سے پہلے ہی طفیل نے اپنا راستہ خود تلاش کرنے کا عزم کر لیا گھر والوں نے طفیل کے تیور دیکھ کر محسوس کیا کہ سارا دھن جارہا ہے سوچا کہ چلو آدھا بانٹ دیتے ہیں۔ بچپن کا شوق ہے اسے پورا کر دو شاید کچھ دیر بعد سمجھ میں آجائے اور پکھا وجیہ واپس گھر آجائے۔ گھر میں طفیل کی بڑی حثیت تھی اس لئے کہ چار بھائیوں کے گھروں میں صرف ایک نرینہ اولاد تھی اس لئے وہ سب کا پیارا تھا لاڈلا تھا۔

سب نے مل کر مشورہ کیا اور طفیل کو مرتسر کے قریب پمبہ گاؤں کے گردوارے میں نوکر رکھوا دیا۔ وہاں طفیل کے نانا ن ربابی کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے گردوارے میں طفیل کا کام گرونانک کی بانی کے بھجن میں سنگت کرنا تھا۔

گردوارے میں ''دھرپد'' بھی گایا جاتا تھا جس کے ساتھ کھلے ہاتھ کا طبلہ بجتا تھا یعنی پکھاوجیئے کی واپسی کی صورت موجود تھی۔ ''دھرپد'' سنگیت کی پرانی شکل ہے جو آج کل کی مروجہ شکل ''خیال'' سے مختلف۔ ''دھرپد'' میں دھنیں بندھی ٹکی ہوتی ہیں اور گائیک کو اختیار نہیں ہوتا کہ رد و بدل کر سکے۔ اپنا کمال دکھا سکے ''دھرپد'' مندر کی پیداوار ہے۔

تین سال تک طفیل پمبہ کے گردوارے میں نانک بانی گاتا رہا پھر اس کا دل اچاٹ ہو گیا اس پر طفیل کے والد اسے گوندوال کے گاؤشالہ میں لے گئے جو ترن تارن کے قریب واقع تھا۔

گوندوال گاؤشالہ میں طفیل کا کام پارٹی کے ساتھ گاؤں گاؤں پھرنا تھا اور گا کر گاؤ رکھشا کا پرچار کرنا تھا۔

گوندوال میں طفیل صرف چار سال رہا پھر وہ راس دھاریوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ راس وہاریئے جگہ جگہ گھوم پھر مجمع لگایا کرتے تھے وہ ناٹک بھی کھیلتے تھے ملغوبہ تھا۔ طفیل نے چند ایک برس ان سے ناٹک اور قصہ خوانی اک فن سیکھا اور پھر انہیں چھوڑ کر نوٹنکی میں شامل وہ گیا۔ نوٹنکی گھومتا پھرتا تھیٹر تھا۔

نوٹنکی میں طفیل نے سسی پنوں' ہیر رانجھا' سوہنی مہینوال' پورن بھگت ہیرو کا پارٹ ادا کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے تھیٹر کی بندشوں سے واقفیت حاصل کر لی۔

اس زمانے میں تھیٹر کی بڑی دھوم تھی۔ تھیٹر کی دنیا میں آغا حشر کا ڈنکا بجتا تھا۔ آغا حشر بڑی قابلیت اور صلاحیتوں کا شخص تھا۔ وہ

ڈرامہ نگار تھا' شاعر تھا' ڈائریکٹر تھا' کمپوزر تھا' اور اداکار تھا نوٹنکی میں طفیل نے ڈرامہ اور تھیٹر کمپوزیشن میں مہارت حاصل کی آج طفیل دوسروں کی پارٹیوں میں کام کرتا رہا تھا اب اس نے نوٹنکی کو چھوڑ کر اپنی سنگیت پارٹی بنالی۔

سنگیت پارٹی قائم کرنے کا ایک فائدہ تو ہوا کہ چند ایک برس میں علاقے مین طفیل کا نام مشہور ہوگیا اور اس کی پارٹی کی مانگ پید اہوگئی لیکن ابھی دنوں قیام پاکستان عمل میں آگیا اور طفیل کو اس علاقے کو چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینی پڑی۔ وہ ملتان آبسا۔

جوں توں کر کے اسے سر چھپانے کے لئے ایک مکان تو مل گیا لیکن گزارے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر زچ ہو کر طفیل نے ملتان میں حلوائی کی دکان کھول لی اور وہ دودھ اور مٹھائی بیچ کر گزارہ کرنے لگا۔

چند ماہ بعد ملتان کا ایک پولیس افسر طفیل کی دکان پر آنکلا۔ وہ طفیل کا پرانا مداح تھا۔ اس نے طفیل کو پہچان لیا بولا "طفیل تم دکانداری کر رہے ہو۔ نہیں یہ نہیں ہوگا۔ بھئی اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟"

طفیل نے کہا "اہن اکام کیسے کروں نہ ساز رہے ہیں نہ ساتھی"

پولیس افسر نے اسے ساز دلا دیئے طفیل نے گھوم پھر کر چند ساتھی تلاش کر لئے اس کے بعد پولیس افسر نے ایک محفل موسیقی کا انتظام کیا اور طفیل کو شہر کے لوگوں سے متعارف کرادیا۔ یوں طفیل کی سنگت پارٹی پھر سے وجود میں اگئی اور ملتان کے گردونواح میں اس کی شہرت پھیلنے لگی۔

ایک دفعہ میں نے طفیل سے تفریحاً پوچھا کہ بھئی تم نے سنگیت کی بہت سے محفلوں میں شرکت کی ہے کیا کوئی ایسی محفل بھی تھی جسے تم ناقابل فراموش سمجھتے ہو؟۔

اس سوال پر طفیل مسکرایا بولا "ہاں! ایک محفل ایسی بھی تھی جنہیں ہم کبھی بھی بھول نہیں سکتے۔ ایک روز شام کے وقت ایک صاحب آئے کہنے لگے پرسوں ہمارے ہاں ایک تقریب ہے آپ اپنی پارٹی لے آئیں۔ اس نے پیشگی کی بجائے ساری رقم معہ کرایہ آمدورفت ادا کردی اور ہمیں اتا پتہ سمجھا دیا۔ یہ جگہ شہر سے پچیس تیس میل دور تھی۔ مقررہ روز ہم شام کے وقت وہاں پہنچ کر حیران ہو گئے چونکہ ویرانے میں بہت بڑے بڑ کے درخت کے قریب ایک بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا اور شامیانے کے باہر دریاں بچھی ہوئی تھیں ہم وہاں پہنچے ہی تھے کہ وہ صاحب آگئے انہوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور دریوں پر بٹھا دیا۔

دو گھنٹے کے بعد ہمارے میزبان کے پانچ چھ ساتھی آگئے ان کے آنے پر محفل شروع ہوگئی آدھی رات تک ہم گاتے رہے پھر انہوں نے ہم سے کہا کہ کسی وجہ سے برات نہیں آئی اب دریوں پر لیٹ کر سو گئے گرمیوں کے دن تھے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی خوب

نیند آئی۔

صبح جب ہم جاگے تو نہ وہ شامیانہ تھا نہ دریاں تھیں ہم سب زمین پر پڑے ہوئے تھے سامنے بڑ کا درخت تھا جس کے قریب ہی ایک کھنڈر تھا یہ دیکھ کر ہم پر خوف طاری ہو گیا اور ہم اپنے ساز اٹھا کر وہاں سے بھاگے۔

پھر یوں ہوا کہ ایک محفل میں ریڈیو پاکستان کے ایک نمائندے نے طفیل کو سنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈیو ٹرانسکریشن میں طفیل اور اس کی پارٹی تقریباً چھ ماہ تک اپنے گانے ریکارڈ کرواتے رہے۔ اس دوران طفیل کو اپنا تھیٹر بنانے کا شوق چرایا اور اس نے تھیٹر قائم کر لیا جس میں آٹھ لڑکیاں تھیں دس لڑکے تھے اور دس سازندے تھے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہوتا ہوا آخر طفیل لوک ورثہ میں پہنچ گیا۔ لوک ورثہ بھی ایک عجیب وغریب ادارہ ہے ۱۹۷۰ء میں دنیا کے تمام ملکوں کے سیانے مل بیٹھے انہوں نے کہ ابھائیو دنیا میں جگہ جگہ ایک کھچڑا کلچر پیدا ہو گیا ہے جو جھکڑ کی طرح چلنے لگا ہے۔ نوجوانان عالم کھچڑا کلچر سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ اگر یہ جھکڑ یونہی چلتا رہا تو ساری دنیا کو گرد وغبار سے بھر دے گا نہ کسی ملک کی موسیقی رہے گی نہ ناچ رہے گا نہ روایت رہے گی۔ نہ رسم ورواج رہے گا نہ آرٹ رہے گا نہ دستکاری رہے گی کسی ملک کی پہچان نہ رہے گی اس لئے بھائیو اپنی اپنی روایات کلچر آرٹ لباس کو محفوظ کر لو ورنہ ہمارے تمام کلچرز موئنجوڈارو بن کر رہ جائیں گے۔ اس پر ۳۲ ملکوں نے اپنے اپنے ہاں لوک ورثہ کے ادارے قائم کر لئے تاکہ اپنے کلچر کو محفوظ کر لیں پاکستان بھی وزارت ثقافت لوک ورثے کا محکمہ قائم کر لیا۔ لوک ورثہ میں شمولیت کے بعد طفیل کو ایک راستہ مل گیا۔ فن میں قیام پیدا ہو گیا۔

طفیل واحد لوک گائیک ہے جس کی گائیکی شدھ راگ ہے۔ طفیل نے مشہور لوگ گیت ماہیا پر تحقیق کی ہے۔ ماہیا ایک مقبول عام لوک گیت ہے جو تقریباً ہر علاقے میں مخصوص علاقائی دھن میں گایا جاتا ہے۔ تحقیق کے بعد طفیل نے ماہیا کو بیسوں لوک دھنوں میں سجایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر راگ ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لئے تشکیل کیا گیا ہے جو صرف جاننے والے پر ہی نہیں بلکہ ان جان پر بھی لازماً اثر رکھتا ہے میرا ایمان ہے کہ اگر فن کار پر نمائش کا جذبہ طاری ہو جائے تو اس میں تاثر نہیں رہتا۔

طفیل میں یہ خوبی ہے کہ وہ سننے والوں میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے گاتا ہے۔

◆◆◆

نی ہاؤ

(کوکب خواجہ)

کوکب خواجہ سے میں چار ایک مرتبہ ملا ہوں۔ میں نے اس کی شخصیت کی صرف دو جھلکیاں دیکھی ہیں۔

پہلی مرتبہ یوں ہوا کہ میں اپنے جنگلی باغیچے میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا کہ دفعتاً میرے سامنے ایک اتنا بڑا چوڑا چکلا چہرہ طلوع ہو گیا۔ فضا پر اتنا رعب طاری ہو گیا کہ پتے سمٹ گئے۔ ساتھ ہی وہ چہرہ اتنا خوشگوار تھا کہ پتے ابھر ابھر کر جھانکنے لگے' شاخیں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

اس چہرے میں چار اوصاف تھے۔ وہ سکیئر (Square) فیس تھا۔ بڑا بارعب تھا۔ اس میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ممتا کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ڈالڈا والی ممتا نہیں دیسی گھی والی۔

میں نے کہا ''فرمایئے!''

بولی۔ ''یہ لائی ہوں۔'' ساتھ اس نے ایک کاپی میری طرف بڑھا دی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بولی۔ ''یہ چین کا سفرنامہ ہے' آپ اسے دیکھ لیں۔''

''کیا دیکھوں؟'' میں نے کہا ''میں تو کبھی چین نہیں گیا۔''

بولی۔ ''زبان دیکھ لیں۔''

میں نے کہا ''بی بی! زبان تو مجھے بھی نہیں آتی۔''

میں نے کہا۔ ''سچ کہتا ہوں۔ جو زبان میں لکھتا ہوں وہ اردو نہیں۔ میں نے خود بنائی ہے۔''

وہ بولی۔ ''میری پہلی کتاب ہے آپ دیکھ لیں میں پھر آؤں گی۔''

دوسری بار وہ آئی تو میں نے کہا۔ ''میں نے دیکھ لی ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہے۔''

بولی۔ مجھے لکھنے کے گر بتایئے"

"نہ نہ" میں نے کہا" لکھنے کے گر کوئی لکھنے والا نہیں بتاتا۔ یہ بھید کی بات ہے لیکن خیر میں یہ بھید آپ کو بتا دیتا ہوں بشرطیکہ آپ کسی اور کو نہ بتائیں۔"

بولی۔"منظور ہے۔"

میں نے کہا" پہلی بات یہ ہے کہ کورے کاغذ پر لکھنا۔"

قلم دائیں ہاتھ سے پکڑنا۔ بائیں میں نہیں۔"

"اور مسودہ کبھی کاپی پر نہ لکھنا"

بولی۔" میں نے تو کاپی پر لکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ پبلشر کو یہ کاپی نہ دکھانا۔ وہ سمجھے گا کالج کی ہے۔ جواب مضمون لکھ کر لائی ہے۔ پبلشر نام دیکھتے ہیں کام نہیں دیکھتے۔ وہاں تیرا چہرہ بھی کام نہ آئے گا۔ ہاں اپنے میاں کے عہدے کا ذکر بار بار کرنا۔ آنے بہانے۔ وہ تعلیم کے ڈائریکٹر ہیں نا۔"

اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"پھر کوئی فکر کی بات نہیں۔ پبلشر مل جائے گا اور کتاب شائع کرنے کے لئے رقم کا مطالبہ نہیں کرے گا۔"

کوکب خواجہ کی یہ پہلی جھلک تھی۔ اس میں معصومیت تھی' خلوص تھا' ممتا تھی۔ میں اس کی معصومیت سے بہت متاثر ہوا۔

کوکب خواجہ کی دوسری جھلک میں نے اس روز دیکھی جب اس کی تصنیف "نی ہاؤ" کی ایک پاش ہوٹل میں رونمائی کی تقریب تھی۔

وہ ادبی محفل نہ تھی۔ بلکہ سٹیٹس محفل تھی۔ کوکب بنی ٹھنی بیگمات کے جھرمٹ میں کھڑی مہمانوں کی مزاج پرسی کر رہی تھی۔ ہونٹوں پر ڈپلومیٹک مسکراہٹ تھی۔

میں اسے پہچان نہ سکا۔ نہ وہ معصومیت تھی' نہ نسائیت نہ ممتا۔ مجھے ایسے لگا جیسے "شوبز"(Show -bis) کی اداکارہ ہو۔

صاحبو! نی ہاؤ ایک "لویٹر" ہے جو کوکب نے اہل چین کے نام لکھا ہے اور اپنے میاں کو مطمئن کرنے کے لئے اسے سفرنامے کا نام دے دیا ہے۔

چین کے اردو دان ناقد چانگ شی شیوان عالم بھی میری بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کوکب خواجہ نے ایک دوسرے کی

محبت میں مبتلا دو عظیم قوموں کے درمیان رضا کارانہ طور پر نامہ بر کا کردار ادا کیا ہے۔

دوستو! یہ چینی لوگ بڑے سیانے ہوتے ہیں کائیاں دیکھو تو معصومیت او نہوں۔ دکھتے نہیں دیکھتے ہیں' باہر کی نہیں اندر کی خبر لاتے ہیں بڑبولے نہیں ہوتے دیکھ کر چپ ہوجاتے ہیں بلھے شاہ کے الفاظ میں ''تو بلھیا وڑ وٹ لے'' یوں جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں' دوستو کا پردہ رکھتے ہیں۔

جب پہلی بار ذوالفقار بھٹو اور قدرت اللہ شہاب چین گئے تو چینیوں نے دونوں مہمانوں کو مناسب مشروب پیش کئے۔ بھٹو صاحب نے تکلف کی بات اس پر چینیوں نے کہا۔ حضور تکلف برطرف۔ ہم چینی پاکستان کو جانتے ہیں۔ پاکستانیوں کی نسبت زیادہ جانتے ہیں۔

ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ایک سمجھدار سیانی قوم ہمیں دوست رکھتی ہے' ایسی قوم جو دوستی نبھانا جانتی ہے۔ یار کی یاری کی طرف دیکھتی ہے یار کے عیبوں کی طرف نہیں دیکھتی۔

اس کتاب میں چار خوبیاں ہیں: چھپائی اور سرورق مصنفہ کی طرح جاذب نظر ہیں' متن میں سادگی ہے' سچائی ہے اور جذبات کی بھیگ ہے۔

کوکب خواجہ نے تین سال چین میں قیام کیا ہے' تین سال انہوں نے اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر نیچے سڑک پر چینیوں کو بائیسکل چلاتے دیکھا ہے' اور تربوز کھاتے ہوئے بری محبت بھری نگاہوں سے دیکھا ہے' یہ جان کر میں بہت حیران ہوا ارے! یہ محترمہ تو دیکھتی بھی ہیں' اور کیا خوب دیکھتی ہیں' میں تو یہ سمجھا تھا کہ کوکب خواجہ صرف دکھتی ہیں۔

اور کیا خوب دکھتی ہیں اور ممتا سے یوں بھری ہوئی ہیں جیسے شہد مٹھاس سے بھرا ہوتا ہے۔

صاحبو! آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ جب بھی میں کسی خاتون میں ممتا کے ڈھیر لگے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے میاں پر ترس آنے لگتا ہے۔ کوکب خواجہ کی طرح بانو قدسیہ بھی ممتا کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

میں اکثر اپنے دوست بانو قدسیہ کے میاں اشفاق احمد سے پوچھا کرتا ہوں یار مجھے ایک بات بتا' اتنے سال بانو قدسیہ کے ساتھ رہنے کے باوجود اپنے بوٹ کے تسمے خود کیسے باندھ لیتا ہے' اپنی واسکٹ کے بٹن کیسے بند کر لیتا ہے' اپنے بٹن ہول میں خود پھول لگا لیتا ہے' اگر تیری جگہ میں ہوتا تو جھولے مڑں پڑا ہوتا ہاتھ میں جھنجھنا ہوتا منہ مین چوسنی ہوتی۔

اللہ کا مجھ پر کتنا کرم ہے کہ میری بیوی ممتا سے آلود نہیں اسے پتہ نہیں ہوتا کہ میں کہاں ہوں' کیا کر رہا ہوں کیوں

کر رہا ہوں اس کی بے نیازی کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اس عمر میں بھی لکھتا ہوں اور میری تحریر چھیڑ ہے۔

کئی نعمتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ہمیں شعور نہیں ہوتا اور جن کے لئے ہم نے اللہ کا شکریہ ادا نہیں کیا۔

ابھی لیجئے چین کی بات' دراصل اس محفل میں میرا مقصد آپ کو چین سے متعارف کرانا ہے چین کی اہمیت کے بارے میں انکشاف کرنا ہے' کتاب تو وسیلہ بن گئی ہے۔

چین کی اہمیت کا مجھے احساس ہوا جب صدر ایوب کے عہد میں بھٹو صاحب اور شہاب صاحب پہلی مرتبہ دوستی لگانے کے لئے چین گئے۔ ان دنوں میں صدر گھر میں شہاب کا او ایس ڈی تھا۔

ہوائی جہاز کی روانگی کے بعد ڈی جی نے جن کے ساتھ شہاب کے ذاتی مراسم تھے' مجھے بائی دی وے انداز سے خبردار کیا کہ ذرا احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان کی سرسری بات میری سمجھ میں نہ آئی تو انہوں نے وضاحت کی۔ کہنے لگے: ہمارے پاس اس بات کا حتمی ثبوت موجود ہیکہ ایک فارن ایجنسی نے شہاب کی چین نوازی کی وجہ سے پلان بنایا ہے کہ شہاب کی عدم موجودگی مین ان کے بنگلے پر شبخون مار کر شہاب کے اکلوتے بیٹے کو اغواء کرلیا جائے۔ کہنے لگے فکر کی کوئی بات نہیں ہمارے حفاظتی انتظامات مکمل ہیں اور ہم نے اس ایجنسی کو پیغام بھی دیا ہے کہ آپ شوق سے تشریف لائیں ہم چشم براہ ہوں گے۔

انہوں نے کہا کہ ہم نے جان بوجھ کر شہاب صاحب کو یہ بات نہیں بتائی کہ وہ فکر مند ہوں گے' آپ بیگم کو نہ بتائیں۔

ارے میں نے سوچا یہ پاک چین دوستی اتنی اہم ہے کیا اتنی کھلتی ہے لوگوں کو کہ بچے اغواء کی دھونس دینے لگے ہیں۔ اللہان کا بھلا کرے جنہوں نے مجھے بڑے پتے کی بات بتائی تھی' کہنے لگے اگر تم کوئی اچھا کام کرنے لگو اور اس میں رکاوٹیں آجائیں تو تمہیں خوش ہونا چاہئے۔ چونکہ شر کی طاقتیں صرف اس کا راستہ کاٹتی ہیں جس کے پہنچ جانے کا خطرہ وہ جس کے پہنچنے کا خطرہ نہ ہو اس کا راستہ نہیں روکتیں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں۔

ارے چین سے دوستی اتنی اہم ہے کہ شر کی طاقتیں تلوار نکال کر کھڑی ہوگئی ہیں۔

ادھر بھٹو صاحب اور شہاب چین مین داخل ہونے سے پہلے ایک ہوٹل میں ٹھہرے جب وہ سیر کر کے واپس آئے تو شہاب نے دیکھا کہ اس کا سوٹ کیس اپنی جگہ سے سرک ہوا تھا' کھول کر دیکھا تو پتہ چلا کہ کسی نے اسے کھولا تھا' شہاب نے ازراہ مزاق ایک فل سکیپ کاغذ پر موٹے حروف میں ''حرام زادہ'' لکھا اس کاغذ کو سوٹ کیس میں سب سے اوپر رکھا اور بند کردیا۔ جب وہ شام کی سیر کے بعد واپس آئیت تو شہاب نے سوٹ کیس کھولا' کاغذ پر کسی نے حرام زادہ کی آخری ''ہ'' کو کاٹا ہوا تھا اور اس کی جگہ چھوٹی ''ی'' لکھی

ہوئی تھی کہ جناب والا میں حرام زادہ نہیں حرام زادی ہوں۔

بڑی طاقتیں جاننا چاہتی تھیں کہ باک چین دوستی کن خطوط پر استوار ہو رہی ہے' لیکن شہاب بڑا کائیاں تھا اس نے متعلقہ کاغذات اپنے جسم کے اردگرد لپیٹ رکھے تھے۔

پھر پاک چین دوستی کے بوٹے پر پہلا پھل لگا۔

ایک روز آدھی رات کے وقت شہاب کے بنگلے کی گھنٹی بجی اور ایسے جذبے سے بجی کہ شہاب گھبرا گیا' باہر آیا تو چینی دوست کھڑے تھے ان کا لیڈر بولا: بے وقت آنے کی معزرت' بات اہم ہے' آپ کے دشمن نے ہم سے پنجہ آزمائی کی تھی' ہماری عوامی فوج نے دھاوا بولا تو دشمن کے اوسان خطا ہو گئے۔ تتر بتر ہو کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اس وقت بھاگ رہا تھا۔

آپ کے لئے بڑا عمدہ موقعہ ہے' اگر آپ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو۔

صدر ایوب اچھے صدر تھے' لیکن سیاست میں کچے تھے' اتنے تہذیب اور اخلاق زدہ تھے کہ موقعہ سے فائدہ اٹھانا گوارہ نہ کیا ورنہ آج رنگ ہی کچھ اور ہوتا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

دوسری مرتبہ شہاب چین گئے تو انہوں نے چینی حکومت سے درخواست کی کہ جناب آپ مجھے ماؤ صاحب سے ملاقات کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے پوچھا آپ ماؤ صاحب سے کیا بات چاہتے ہیں' شہاب نے کہا ایک عظیم انسان ہیں مین انہیں صرف سلام کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر چینیوں نے شہاب کو ماؤ صاحب سے ملنے کی اجازت دے دی۔ ماؤ صاحب نے شہاب کو بٹھا کر ان سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔

گفتگو کے دوران شہاب نے پوچھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک سوال پوچھوں؟

ماؤ بولے: بے شک پوچھئے۔

شہاب نے کہا: آپ نے کیمونسٹ سوسائٹی کی تشکیل کی لیکن اپ نے اسے گاڈلس سوسائٹی کیوں بنا دیا کوئی سا خدا چن لیتے۔ اس میں کیا حرج تھا۔

جناب والا! خدا تو ایک تکیہ ہے' جس پر ٹیک لگا کر تھکا ہارا سر سکون پاتا ہے' ایک عظیم تر ہستی کے سامنے سر جھکانا تو بندکا جبلی جذبہ ہے۔

ماؤ نے جواب دیا ہاں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ کس خدا کو اپنا لیا جائے یا گاڈلس سوسائٹی رہے فیصلہ ہوا کہ اس مسئلے پر اگلی میٹنگ

میں طے کیا جائے گا جہاں ہر کوئی اپنی اپنی تجویز معہ دلائل پیش کرے گا۔

آپ شاید نہیں جانتے ماؤ بولے کہ میں Religons Comparitive کا طالب علم تھا' میرا خیال تھا کہ کمیونسٹ سوسائٹی کو اگر کوئی خدا سوٹ کرتا ہے تو وہ صرف اسلام کا خدا ہے' میں نے اسی لائن پر اپنا پیپر تیار کیا تھا۔

اس دوران انگریز کو پتہ چل گیا کہ ایسی میٹنگ ہونے والی ہے' انہوں نے ہندوستان کے چند اسلامی علماء کمیونسٹ سوسائٹی کے خلاف فتوے لے کر انہیں چھپوا کر ہوائی جہاز کے ذریعے ہزاروں کی تعداد میں یہاں پھنکوا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس روز میٹنگ تھی ہر شخص کے ہوتھ میں وہ لیف لٹ تھا' اس صورت حال میں میرا کچھ کہنا بیکار تھا۔

شہاب نے کہا: کیا میں اس بیان کا حوالہ دے سکتا ہوں۔

ماؤ بولے: نہیں! جب تک مین زندہ ہوں' میرے اس بیان کی تشہیر نہ کیجئے۔

صاحبو! چین پاک دوستی کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی ہے ابھی اور ہوگی اور اور ہوگی اس شان وشوکت سے ہوگی کہ دنیا حیران رہ جائے گی انشاء اللہ لیکن شہاب کو یہ دوستی مہنگی پڑی' اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

بڑی طاقتوں نے فیصلہ کرلیا کہ صدر ایوب اور شہاب کا باہمی رابطہ توڑ دیا جائے جب تک ایوب شہاب کے زیر اثر رہیں گے ہماری دال نہیں گلے گی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شہاب کو ہالینڈ کا سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔

جناب والا! میری آخری بات کھل کر کہنے والی بات نہیں ہے یہ ادھ کہی بات ہے' کہنے والی نہیں' سمجھنے والی بات ہے۔

ہمارے لئے چین کی اہمیت جدید نہیں قدیم ہے۔

سرکار دو عالم نے فرمایا تھا' علم حاصل کرو چاہے اس کے لئے چین جانا پڑے

دوری کے حوالے سے اور بھی ملک تھے جو دور تھے۔ علم کے حوالے اور بھی ملک تھے جو علم کا گہوارہ تھے' لیکن عزاز چین کو حاصل ہوا۔

پھر علامہ اقبال تھے جو عالم بھی تھے' قانون دان تھے' بزرگ تھے شاعر تھے' عام شاعر نہیں' صاحب نظر شاعر تھے۔ PROPHETIC شاعر تھے SEER ''میرا پیام اور ہے'' قسم کے شاعر تھے۔ اقبال فرماتے ہیں: چین وعرب ہمارا ہندوستان ہمارا۔ ارے یہ کہا کہہ دیا' اتنا کمزور جغرافیہ نہ چین ہمارا تھا نہ عرب ہمارا تھا نہ ہندوستان ہمارا تھا۔ اتنا بڑا عالم اتنی غلط بیانی۔

صاحبو! یہ جو صاحب نظر ہوتے ہیں' کئی بار ان کی نگاہ مستقبل کی جانب نکل جاتی ہے' یوں حال اور مستقبل خلط ملط ہو جاتے ہیں' ایک اور جگہ جناب اقبال کے کلام میں انجانے میں حال اور مستقبل کی کھچڑی پک گئی' فرمایا ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے' گراں خواب چینی سنبھلنے لگے' ان دنوں ابھی چینی گراں خواب تھے' سنبھلے نہ تھے۔ اب تو چینی سنبھل چکے ہیں' ایسے سنبھلے ہیں کہ انشاءاللہ اک دن سپر پاور بنیں گے' البتہ ہمالیہ کے چشمے ابھی ابلنے باقی ہیں' پیارے وہ دن دور نہیں آپ اپنی آنکھوں سے نظارہ کریں گے۔

اب حکیم سنائی کی بات سنئے۔۔۔۔۔۔ حکیم سنائی کا کیا مرتبہ ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ''ما از پئے سنائی وعطار آمدیم'' فرماتے ہیں سنائی اور عطار کا مرتبہ مجھ سے کہیں بلند تر ہے۔

سنائی بہت بھرے ہوئے تھے' کبھی کبھی چھلکاتے ایک بار مستقبل پر جو نگاہ پڑی تو چھلک گئے اور کہہ دیا کہ ''گرفتہ چینیاں احرام' مکی خفتہ در بطحا۔۔۔۔۔۔'' مستقبل پر نظر پڑی تو حکیم سنائی نے دیکھا کہ مکہ کے لوگ خواب غفلت میں ہیں اور چینیوں نے احرام کو پکڑ رکھا ہے۔

جناب والا اقبال نے خود مستقبل کے اس منظر کی تصدیق کی ہے۔ بال جبریل میں لکھتے ہیں۔

حضور حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا
ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام مکی خفتہ اور بطحا

جواب شکوہ میں اقبال لکھتے ہیں۔

اپنی جانب سے بات نہیں کرتے' چونکہ ''شکوہ'' کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے کے نام پیغام دیتے ہیں۔ اس کے آخر میں قرآن کریم کی ایک آیت بھی شامل ہے تو صاحبو سنئے کہ بہ زبان اقبال اللہ تعالیٰ کیا پیغام دیتے ہیں۔ اقبال کے نام آپ کو میرے ہمارے نام پیغام فرماتے ہیں۔

''دہر میں اسم محمد سے اجالا کردے''

پھر اللہ تعالیٰ وضاحت کرتے ہیں کہ اسم محمد کی تجلی کہاں کہاں نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

دشت میں، دامن کوہسار میں، میداں میں ہے
بحر میں موج کی آغوش میں طوفاں میں ہے
چین کے شہر مراکش کے بیاباں میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایماں میں ہے

صاحبو! چین ہمارا اعزاز ہے، چین ہمارا مستقبل ہے، چین ہماری تقدیر ہے۔۔۔۔۔۔۔اور مبارک ہیں وہ لوگ اور کوکب خواجہ جیسے فنکار جو پاکستان اور چین کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کا جتن کرتے ہیں۔

◆◆◆

اکیسویں صدی کا بزرگ

(سید سرفراز احمد شاہ)

مین گیٹ کے پیچھے ایک شخص عام سے کپڑے پہنے ننگے سر ننگے پاؤں ہمارا استقبال کرنے کے لیے کھڑا تھا۔ ارے کیا یہ وہ ہی شخص ہے جو صبح تھری پیس سوٹ پہنے شوخ نکٹائی لگائے اپنی ہانڈی کار میں بیٹھا تھا جس نے بڑے خشک لہجے میں مجھ سے کہا تھا شام کو تشریف لائیے اور پھر ایکسلیٹر دبا کر زوم گاڑی دوڑا کر لے گیا تھا۔ نہیں یہ شخص نہیں ہو سکتا۔ کہاں وہ بنا سجا بیوروکریٹ کہاں یہ درویش صفت آدمی۔ ضرور یہ شخص سید سرفراز احمد شاہ کا ملازم ہوگا۔

میں نے گھر کی جانب نظر دوڑائی وہ ایک چھوٹا سا معمولی سا مکان تھا لگتا تھا جیسے تین مرلے پر بنا ہو۔ دیواریں خستہ حال تھیں سامان پھٹیچر۔ وہ ڈرائنگ روم جس میں ہمیں بٹھایا گیا تھا برائے نام ڈرائنگ روم تھا' پرانے زمانے کی بیٹھک سے بھی کم تر' دو ایک بینچ نما صوفے جو بوسیدہ تھے فرش خالی تھا۔ پھر شاہ صاحب تشریف لے آئے۔ کرسی پر بیٹھ گئے ارے یہ تو وہی ملازم ہے جو گیٹ کے پیچھے کھڑا تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے غور سے شاہ کی طرف دیکھا۔

جوانی بھرپور تھی' کلین شیو چہرے پر وقار تھا' جیسے حکم چلانے کا عادی ہو ذہانت تھی' رعب تھا' خود اعتمادی تھی ہونٹوں میں ہلکا سا تبسم دبا ہوا تھا جیسے SENSE OF HUMOUR کو دبا کے رکھا ہوا ہو۔ انداز میں خود اعتمادی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے گفتگو میں ریوڑی جیسا کڑاکا' تھا بات میں سے کرتا تھا لیکن اس ''میں'' میں ہم رنگ تھا۔

گفتگو میں مسئلے نہ تھے' نصیحتیں نہیں تھیں۔ حضرت موسیٰ والے ڈونٹس تھے لچھے دار تقریر نہیں تھی یوں جیسے کوئی بزنس میں مختصر مگر کام کی بات کرتا ہے۔ شاہ ہمیں متاثر کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

نہ ہی وہ ہم سے متاثر تھا۔ ہم تینوں اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ بانو قدسیہ اشفاق احمد اور میں۔

میں شاہ سے ملنے کیوں گیا تھا؟

اس لئے نہیں کہ مجھے کوئی طلب تھی' کوئی دنیاوی طلب' طلب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے تو اللہ نے دنیا میں ہی جنت دے

رکھی تھی میں حیران ہوتا تھا کہ اللہ میاں مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں حالانکہ میں ان کرم نوازیوں کو قطعی طور پر ڈیزرو نہیں کرتا تھا۔ زندگی بھر انہیں نے قدم قدم پر میری مدد کی تھی' ان دنوں میں بھی جب میں انہیں نہیں مانتا تھا اور ان دنوں بھی جب میں انہیں ماننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے میرا احاطہ کر رکھا تھا۔ میرے چاروں طرف بوٹے بوٹے میں' پتے پتے میں' ذرے ذرے میں' اللہ میاں بیٹھے جھولا جھول رہے تھے۔ مسکرا رہے تھے زیر لب کہہ رہے تھے۔ "اب بول"

اللہ کی بخشی ہوئی اس جنت میں میری یہ کیفیت تھی کہ اگر کوئی کہتا مانگ کیا مانگتا ہے جو مانگے گا تو میں سوچ میں پڑ جاتا کہ کیا مانگوں۔ مجھے انہوں مانگ سے اس قدر بے نیاز کر رکھا تھا۔ اس لیے شاہ کے پاس کوئی مانگ لے کر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں شاہ کے پاس اس لئے بھی نہیں گیا تھا کہ ایک بزرگ کی خدمت حاضری' دوں' اس لئے کہ بزرگ کا بھید مجھ پر کھل چکا تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بزرگ ایک عزاز بھرا مقام ہے' وہ تخت پر براجمان ہوتا ہے' سر پر تاج ہوتا ہے' صاحب حکم ہوتا ہے' جو حکم دے اس کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ مستقل اس کی نگاہ میں ہوتا ہے تقدیر کو بدلنے کا طاقت حاصل ہوتی ہے۔

زندگی میں مجھے چند ایک بزرگوں کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا ہے میں نے دیکھا ہے کہ بے شک ہمارے نزدیک بزرگ محترم ہے لیکن دراصل وہ ایک چاکر ہے اس کا کام حکم چلانا نہیں بلکہ تعمیل حکم ہے۔ سر تسلیم خم کرنا ہے' حکم کے بارے میں پوچھنا نہیں جانتا نہیں سوچتا نہیں صرف تعمیل۔

حکم ہوتا ہے کہ اپنے بیٹے کو قربان کر دو وہ نہیں سوچتا کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ بیٹے کی محبت اس کے دل میں تذبذب کی کیفیت پیدا نہیں کرتی۔ وہ اپنے بیٹے کو انگلی لگا کر چون وچرا کئے بغیر قربان گاہ کی طرف چل پڑتا ہے۔

بزرگ اپنے لئے کچھ مانگ نہیں سکتا وہ اپنی میں کو تیاگ چکا ہے دوسروں کے لئے' پہلے مشیت ایزدی میں جھانک کر دیکھتا ہے کیا منشاء ایزدی کرم نوازی پہ مائل ہے' کیا مانگنے کی اجازت ہے' گنجائش ہے۔ بزرگ زندگی بھر آزمائش بلے جیتا ہے۔ ہاں بزرگ کی بھید مجھ پر کھل چکا تھا میں شاہ کی خدمت میں حاضری دینے کے خیال سے نہیں گیا تھا۔ میں تو شاہ کی خدمت میں شکریہ ادا کرنے گیا تھا شاہ نے مجھے ذہنی کشمکش سے رہائی دلائی تھی عالم تذبذب سے باہر نکال دیا تھا مجھے یقین اور اطمینان کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ یہ ذہنی عذاب مجھ پر چار ایک ماہ سے طاری تھا ان دنوں میں اپنی آپ بیتی کا دوسرا حصہ الکھ نگری لکھ رہا تھا۔

میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ قدرت اللہ شہاب کے متعلق کون سی بات لکھوں کون سی گول کر جاؤں۔ قدرت اللہ شہاب سے میری

عقیدت اس لئے نہیں تھی کہ وہ ایک بزرگ تھا بلکہ اس لئے تھی وہ ایک عظیم انسان تھا۔اس کے کردار کے دو نیوکلس تھے ایک عجز کا دوسرے وسعت قلب طبعی طور پر میں ایک کہہ دینے والا شخص ہوں لیکن قدرت اللہ شہاب ایک گپت بزرگ تھے انہوں نے کبھی اپنے منہ سے تسلیم نہیں کیا تھا کہ وہ بزرگ ہیں انہوں نے اپنی کتاب شہاب نامے میں کئی باتوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میں سوچ میں پڑا تھا کیا ان باتوں کا ذکر کروں یا نہ کردوں اگر ذکر کروں تو یہ خوف درپیش تھا کہ شہاب کی خوسنودی نہ کھوبیٹھوں شہاب سے فیض پانے والوں میں سے ایک صاحب صدیق رئی تھے۔صدیق واحد شخص تھا جس کا شہاب سے کلام کا تعلق تھا اس نے شہاب سے کہا تھا جناب مجھے کچھ پڑھنے کے لئے دیجئے۔ہم سب پکی پکائی کے قائل تھے صدیق پکا کر کھانے کا شوقین تھا۔گمان غالب ہے کہ شروع شروع میں قدرت نے اسے کچھ بنا کر ٹرخا دیا تھا لیکن تین سال کے بعد جب رائی نے آکر کہا کہ جناب میں نے کلام میں کبھی ناغہ نہیں کیا تو قدرت بہت متاثر ہوا اس کے بعد بڑی توجہ سے صدیق کو بتانے لگا تھا۔اب چھ سال بعد صدیق ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا کی اسے کشف ہونے لگا تھا۔

سب سے پہلے میں نے صدیق سے پوچھا میں نے کہا یہ بتا کیا شہاب الکھ نگری پر ناراض تو نہیں ہوں گے جیسے وہ لبیک کی اشاعت پر ہوئے تھے۔صدیق نے دیکھ کر مجھے گول مول سا جواب دیا کہنے لگا بے شک آپ الکھ نگری لکھیں وہ منع نہیں کرتے۔ صدیق کی بات سن کر میں مطمئن نہیں ہوا تھا چند ایک ماہ بعد میں نے پھر صدیق سے کہا کہ پھر دیکھو۔اس نے دیکھ کر جواب دیا کہ پہلی مرتبہ یہ بات شہاب کو ناگوار گزری تھی لیکن اب وہ رضامند ہیں۔یہ سن کر صدیق پر میرا رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا میں مطمئن نہ تھا۔

صدیق کے علاوہ میں نے دو ایک اور بزرگوں سے بھی پوچھا تھا ان کا جواب بھی مجھے مطمئن نہ کرسکا تھا میں ایک ادیب ہوں میرے قاری اکثر مجھے خط لکھتے رہتے ہیں۔ان میں لاہور کی ایک خاتون صفیرہ شیریں بھی تھی۔صفیرہ شریں ایک عابدہ خاتون ہیں اس کے خطوط مین مسئلے مسائل ہوتے تھے اور وہ میرے لئے ہمیشہ دعا گو تھیں۔ایک بار شیریں نے مجھے لکھا کہ ''میں نے آپ کا خط اپنے دوستوں کے دوست کو دکھایا تھا۔'' اسا پر مجھے غصہ آیا میں نے کہا کہ آپ نے میرا خط کسی کو کیوں دکھایا۔

محترمہ نے کہا میں تو اپنا ہر خط انہیں دکھاتی ہوں۔میں نے کہا وہ کون ہے جسے تم ہر خط دکھاتی ہو۔وہ بولی گزشتہ سات سال سے ہفتہ وار مین ان کی حاضری دیتی ہوں۔وہ بہت بڑے صاحب کشف ہین اور صاحب دعا ہیں۔میں نے کہا بی بی اگر وہ صاحب کشف ہیں تو ان سے ایک بات پوچھ دو۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اسلام آباد کے INSTITUTE OF MEDICAL SCIENCES میں داخل

تھا۔ میرے پراسٹریٹ کا آپریشن ہو چکا تھا۔ ہسپتال میں انفیکشن ہو چکی تھی۔ سوڈومانو کیڑے میرے یوریز سسٹم میں داخل ہو چکے تھے' جب پیپ بناتے۔ ایک ماہ سے روزانہ مائی سین کے دو ٹیکے لگ رہے تھے لیکن سوڈومانو مرے نہیں تھے۔

ان دنوں مجھے یہ فکر لاحق تھا کہ کہیں الکھ نگری ادھوری نہ رہ جائے ویسے مرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہ تھا ۸۶ سال بھرپور زندگی گزار چکا تھا کرم نوازیوں بھری زندگی۔ میں نے محترمہ کو لکھا کہ بی بی ان صاحب سے یہ پوچھو کیا میری کتاب الکھ نگری مکمل ہوگی۔

چند دنوں بعد محترمہ کا خط وصول ہوا خط میں شاہ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک جملہ تھا۔

''ہم نے الکھ نگری مکمل شکل میں دیکھ لی''

شاہ صاحب کا یہ جملہ پڑھ کر میں نے محسوس کیا جیسے الکھ نگری مکمل شکل میں میں نے خود دیکھ لی ہو فکر دور ہو گیا اطمینان چھا گیا یوں لگا جیسے شاہ نے صرف یہ جملہ نہ لکھ بھیجا ہو بلکہ یقین اور اطمینان کا جذبہ ٹرانسمٹ کر دیا ہو۔

پھر جب الکھ نگر مکلم ہوگئی اور مسودہ لے کر پبلشر کو دینے لاہور گیا تو خیال آیا کہ کیوں نا شاہ صاحب کا شکریہ ادا کروں۔ شاہ کی طرف اکیلے جانے کی ہمت نہ پڑی اس لئے میں نے اشفاق احمد اور بانو سے درخواست کی کہ میرے ساتھ چلو اور خلاف معمول وہ تیار ہو گئے۔ ہاں تو یہ تھے کوائف شاہ سے ملنے کے۔

اس وقت ایک بج نما صوفے پر ہم تینوں بیٹھے تھے اشفاق احمد قدسیہ میں سامنے کرسی پر شاہ صاحب بیٹھے تھے شاہ سے وہ ملاقات بزرگوں کی محفل سے یکسر مختلف تھی۔ اس محفل میں چار عام آدمی بیٹھے تھے نہ تو شاہ کا رویہ سرکار قبلہ جیسا تھا نہ ان کی وضع قطع ان کا لباس یا طرز گفتگو بزرگوں جیسی تھی' نہ ہی ہم تینوں مریدوں کی طرح احترام زدہ تھے۔

مجھے علماء اور بزرگوں سے ایک بڑی شکایت ہے۔ وہ التزاماً الگ قسم لباس پہنتے ہیں' الگ قسم کا رویہ روا رکھتے ہیں' الگ قسم کا انداز گفتگو اپنا لیتے ہیں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ہم میں سے نظر آتے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ جان بوجھ کر التزاماً ہم سے الگ نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا مقصد ایک امتیازی حیثیت حاصل کرنا ہوتا ہے میری دانست میں اگر بزرگ عوام جیسا ہو' عوام میں گھل مل جائے تو وہ عوام پر زیادہ اثر انداز ہو سکتا ہے اور عام طور سے بزرگ کا کام عوام پر اثر انداز ہونا ہوتا ہے۔

بے شک داڑھی رکھنا سنت ہے' اسوہ حسنہ ہے مگر لگتا ہے کہ عام طور پر لوگ اس لئے داڑھی نہیں رکھتے کہ حضور کے نقش قدم پر چلیں بلکہ اس لئے کہ داڑھی رکھنے سے انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے علماء کرام تو اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لئے ایک امتیازی حیثیت حاصل کرنے کیلئے بہت اہتمام کرتے ہیں۔

سیدھی بات ہے کہ جب تک دکان کو مال سے نہ بھر لوتب تک دوکان پر بورڈ نہ لگاؤ۔ جب تک حضور کے کردار سے اپنی شخصیت کو منور نہ کرلو داڑھی نہ رکھو ورنہ لوگوں کو گمراہ کرنے کا امکان ہے۔ زندگی بھر میں یہی سنتا رہا ہوں کہ داڑھی رکھو سنت ہے لبوں کو کٹواؤ سنت ہے پاجامے کی موری تنگ رکھو سنت ہے میں نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ وعدہ کرو تو نبھاؤ سنت ہے کسی سے بدسلوکی نہ کرو سنت ہے جہاں تک ہو سکے خلق خدا کی خدمت کرو سنت ہے اس وقت شاہ ہمارے پاس یوں بیٹھا تھا جیسے ہم میں سے ہو۔

اس کے لباس انداز گفتگو میں کوئی امتیازی شان نہ تھی۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ ہم سے زیادہ جانتا ہے اور اس لئے ہمیں نصیحت کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس میں کوئی دنیاوی دینی یا روحانی SUPERIORITY کی جھلک نہ تھی۔

اس ملاقات میں شاہ نے صرف دو باتیں کہیں کہنے لگے چاہے ہم نوجوانوں کو پسند کریں یا نہ کریں ہر صورت میں کام نوجوانوں نے ہی کرنا ہے۔ نوجوانوں وک بدلنے کو ایک طریقہ ہے صرف ایک انہیں رد نہ کرو خود کو ان سے برتر نہ جانو بلکہ ان جیسے بنو تا کہ ان کا کانفی ڈینس حاصل ہو جائے صرف اسی صورت میں آپ ان کو بدل سکتے ہیں۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے پوچھا آپ کی الکھ نگری ختم ہوگئی کیا۔

میں نے جواب دیا ''جی ختم ہوگئی''

بولے مفتی صاحب ابھی آپ کو تصوف پر کتاب لکھنی ہے۔

میں نے کہا جناب یہ کیسے ہوگا میں تو اسلام اور تصوف کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔

کہنے لگے ہمیں یہ معلوم کیسے ہوگا ہم نے تو دیکھا ہے کہ ہوگا۔ ہم جو دیکھتے ہیں بتا دیتے ہیں کیوں کیسے تو وہی جانتا ہی جو قادر مطلق ہے۔ اشفاق احمد اس دوران شاہ کو جانچنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پیدائشی طور پر مین آف آئیڈیاز ہے یعنی سوچوں کا مارا ہوا ہے۔ جانچتا ہے پرکھتا ہے تحقیق کرتا ہے تماشہ دیکھتا ہے بھگتا نہیں بونو بھیگی بیٹھی تھی۔ بولی میرا بیٹا شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتا ہم چاہتے ہیں کہ شادی کرلے۔

شاہ نے بانو کی بات غور سے سنی پھر گردن کو ایک خاص زاویے پر جھکا کر بیٹھ گئے۔ ان کے ماتھے پر ایک شدت بھری تیوری پڑ گئی لگتا تھا جیسے بڑی شدت سے توجہ مرکوز کی گئی ہے بڑا STRAIN پڑ رہا ہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا بولے بی بی شادی کرلے گا اور وہیں کرے گا جہاں آپ کی مرضی ہوگی۔

پھر انہوں نے میز پر رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی سویٹ اٹھائی اور بانو کو دے دی "بولے" یہ بیٹے کو کھلا دینا۔ شاہ سے ملاقات کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا اللہ یہ شاہ کیا چیز ہے میں نے کئی ایک بزرگ دیکھے تھے ایسے بھی جو برملا تھے اور ایسے بھی جو در پردہ تھے لیکن شاہ کا رنگ ہی اور تھا۔

پھر مجھے شاہ کی بات یاد آئی۔ ابھی آپ کو تصوف پر ایک کتاب لکھنی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے میں نے سوچا۔

قدرت اللہ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے مفتی صاحب عقیدت کو چھوڑیئے عقیدت اچھی چیز نہیں' عقیدت پالیئے۔ میں نے کبھی عقیدے کی چرف توجہ نہ دی تھی کبھی اسلام کا مطالعہ نہ کیا تھا میں صرف تذکرہ پڑھتا تھا مجھے تذکروں سے دلچسپی تھی لیکن مجھے تذکروں کے مصنفوں سے شکایت تھی کہ وہ بزرگوں کی کرامتیں بیان کرتے تھے ان کے کردار کی عظمت کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ میری دانست مین بزرگوں کی کرامات یا مجاہدوں کی نسبت ان کا کردار زیادہ اہم ہوتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ میرے محسن قدرت اللہ شہاب کا کہنا ہے کہ تصوف دراصل ایک شارٹ کٹ ہے کنڈرگارٹن کی طرح کھیل کے بہانے تعلیم دینا' قدرت اللہ شہاب صرف شریعت کو اہمیت دیتے تھے وہ شارٹ کٹ کے قائل نہ تھے ان کے نزدیک بہترین مسلمان وہ عام شخص ہے جو سارا دن اپنے بچوں کے لئے محنت مشقت کرتا ہے ان کے لئے روٹی کماتا ہے شام کو گھر آتا ہے والدین کی خدمت کرتا ہے بیوی سے اچھا سلوک کرتا ہے بچوں سے کھیلتا ہے پڑوسی کو پوچھتا رہتا ہے۔ محلے والوں کی خدمت کرتا ہے' اللہ کے احکام مانتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے میں نے سوچا کہ تصوف پر کتاب لکھوں' پھر شاہ کے متعلق ہمیں کوائف کا پتہ چلا۔ پتہ چلا کہ وہ فارن کوالیفائیڈ ایم بی اے ہیں۔ حکومت پاکستان میں کام کر چکے ہیں فارن فرموں کے ساتھ کام کر چکے ہیں ڈیوٹی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس وقت ایک پاکستانی فرم میں نمبر دو ہیں۔ صبح دفتر جاتے ہیں' شام ڈھلے لوٹتے ہیں دفتر کا کام اس جذبے سے کرتے ہیں جیسے مذہبی فریضہ انجام دے رہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ تنخواہ کافی سے زیادہ ہے بڑے بنگلے میں ٹھاٹ سے رہ سکتے ہیں لیکن ٹھاٹھ میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ لوگوں کو کھانا کھلانے کے بہت بڑے شوقین ہیں۔ ناشتے پر کھانے پر روز آٹھ دس مہمان ہوتے ہیں۔ خصوصی دنوں پر مہمانوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ان کی بیگم مہمانوں کے لئے پکاتے پکاتے تھک جاتی ہیں لیکن چہرے پر اکتاہٹ یا تھکاوٹ کا نشان نہیں آتا سادگی معصومیت اور بشاشت' بڑی ہنس مکھ ہیں' ان کے بچے سارا دن مہمان نوازی میں لگے رہتے ہیں۔ گھر میں کوئی نوکر نہیں ہے۔ میں نے پوچھا شاہ جی آپ کی بیگم اس مسلسل مہمان داری کے خلاف احتجاج نہیں کرتیں کیا۔ کہنے لگے پہلے کرتی تھیں میں نے بہت سمجھایا کہ بی بی ہمارا گھر کا یہ سارا رنگ رونق مہمانوں کے دم کرم سے ہے اگر ہم نے کھلانا چھوڑ دیا تو مشکل پڑ جائے گی۔ خیر

صاحب وہ نہ مانیں تو میں نے انہیں کہہ دیا کہ لو جیسے چاہو خرچ کرو اس نے خست کی نتیجہ یہ ہوا کہ فاقے آنے لگے میں نے کہا دیکھ لیا بی بی پھر وہ مان گئیں اب وہ بڑی خوشی سے مہمانوں کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔

صبح دفتر جانے سے پہلے شاہ صاحب میانی صاحب میں اپنے قبلہ حضور کی حاضری دیتے ہیں اگرچہ کار مزار مبارک تک جاسکتی ہے لیکن جذبہ احتراما منع ہے۔ بہت دور کار روک لیتے ہیں' پیدل چل کر حاضری دیتے ہیں' پھول چڑھاتے ہیں پھر چند منٹوں کیلئے اس جگہ جا کر بیٹھتے ہیں جہاں حضرت صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ ہر سوموار کو مغرب کی نماز کے بعد حاضری کی عام اجازت ہوتی ہے سو ڈیڑھ سو حاجت مند حاضری دیتے ہیں۔ یہ محفل مسئلے مسائل کی محفل نہیں ہوتی نہ ہی درس و تدریس ہوتے ہیں' نہ ہی پند و نصائح۔ یہ محفل صرف دعا تک محدود ہوتی ہے حاجت مند باری باری آتے ہیں شاہ صاحب گردن ٹیڑھی کر کے بیٹھ جاتے ہیں ماتھے پر بڑی تیوری سی پڑ جاتی ہے' لگتا ہی جیسے شدت کا دباؤ پڑ رہا ہے۔ شاہ حاجت مندوں کی مشکل کا مختصر سا تذکرہ سنتے ہیں مشکل کو دور کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ دوٹوک بات کرتے ہیں اور اگلے حاجت مند کو اشارہ کر دیتے ہیں۔ لمبی بات نہ کرتے ہیں نہ ہی سنتے ہیں۔ بحث نہیں کرتے' انداز مین اتنی خود اعتمادی ہوتی ہے کہ حاجت مندوں کو مزید بات کرنے کی جرات نہیں پڑتی۔

مثال کے طور پر دو خواتین میرے کہنے پر شاہ صاحب سے ملیں خصوصی ملاقات کے بعد انہوں نے مجھے خط لکھا' لکھا کہ جب شاہ صاحب تشریف لائے تو سارا کمرہ ان کے رعب سے لبالب بھر گیا۔

انہوں نے بات شروع کی اگرچہ انہوں نے بڑے اخلاق سے ہمیں مخاطب کیا بولو بی بی آپ کیسے تشریف لائی ہیں اس کے باوجود ان کی آواز میں کچھ ایسی کھنک اور بے تکلفی تھی کہ ہمارے دل دھک دھک کرنے لگے' اس حد تک کہ ہمارے لئے جواب دینا مشکل ہو گیا' دم گھٹنے لگا۔ مختصر یہ کہ جب ہم کمرے سے باہر نکلیں تو باہر گلی میں رک کر ہم نے لمبے لمبے سانس لئے دیر تک رکی رہیں پھر کہیں جا کر نارمل ہوئیں۔ کیفیت یہ تھی کہ "کہاں کا دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا" یہ کوئی عام خواتین نہیں تھیں کالج کی لیکچرار تھی دوسری پرنسپل' شاہ صاحب مریضوں کو دوا بتاتے ہیں مثلاً ایک بار مجھ سے کہنے لگے آپ امرود کھایا کریں میں نے امرود کھائے تو بہت فائدہ ہوا لیکن جلد ہی امرودوں کا موسم ختم ہو گیا۔ میں نے شاہ صاحب کو خط لکھا عالی جاہ یا تو امرودوں کو حکم دیجئے کہ وہ واپس آجائیں یا خربوزے کو حکم دیجئے کہ وہ فی الفور امرودوں کے خواص پیدا کر لیں۔ شاہ صاحب نے کہا بھئی ہم تو دعا کرنے والے ہیں' حکم دینے والے نہیں۔ میرے بیٹے عکسی نے شاہ صاحب سے پوچھا شاہ دیکھ کر بولے ایلوپیتھی کی دوا آپ کو فائدہ نہیں پہنچائے گی صرف حکیم کی دوا فائدہ پہنچائے گی۔ ہم نے وہ دوا دیکھ لی ہے جو آپ کو فائدہ پہنچائے گی لیکن ہمیں اس دوا کا نام نہیں معلوم' اس کی شکل گلقند جیسی ہے

آپ حکیم کو بانہ دکھائیں جو دوا وہ دے مجھے دکھائیں دوا دیکھ کر میں پہچان لوں گا کہ یہ وہ ہی دوا ہے یا نہیں۔

سرفراز شاہ کے کشف کی نوعیت عجیب سی ہے ایسا کشف کبھی دیکھنے میں نہیں آیا عام طور سے صاحب کشف نام پوچھتے ہیں ماں کا نام پوچھتے ہیں شاہ صاحب نے کبھی نام نہیں پوچھا مثلاً ایک روز شاہ کا فون آیا میری بہو تہمینہ نے چونگا اٹھایا اور کہنے لگی شاہ جی میں ایک نیا کام شروع کرنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ ذرا دیکھیں تو کیا میرے حق میں مفید رہے گا۔ شاہ صاحب خاموش ہو گئے کچھ دیر کے بعد بولے جو کام آپ شروع کر رہی ہیں کیا اس میں ایک اور خاتون بھی آپکے ساتھ شریک ہے۔ ہم سب حیران رہ گئے چونکہ یہ بات درست تھی۔ ایک صاح شاہ صاحب کے پرانے جاننے والے ہیں پروفیسر علاؤ دین اختر بہت پڑھے لکھے ہیں آسانی سے ماننے والے نہیں عقل کے کچھ زیادہ ہی قائل ہیں' بات تول کر کہنے والی چیز ہے دوسرا سمجھے نہ سمجھے۔ ان سے ایک دن میں نے کہا اختر' شاہ کے کشف کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے بولے کوئی رائے نہیں دیکھتا ضرور ہوں سمجھتا نہیں ہاں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں مثلاً ایک دن میں نے شاہ کو فون کیا کچھ پوچھوں انہوں نے توقف کیا پھر دفعتاً بولے یہ جو خاتون آپ کے پیچھے سے گزری ہے یہ کون ہے۔

اس میں حیرت کی کیا بات ہے میں نے پوچھا' شاہ جی یہ کیسا جنتر منتر ہے کہنے لگے کون سا' میں نے کہا یہ جسے آپ کشف کہتے ہیں' یہ تو کشف کا انوکھا بڑا انڈ ہے آج تک میں نے ایسا کشف نہیں دیکھا بولے ایک بار میں نے حضرت صاحب سے اس علم کے بارے میں عرض کی تو فرمایا میں نے تمہیں ایسا علم عطا کیا ہے جو ایک وقت میں دنیا میں صرف ایک شخص کے پاس ہی ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور اب تو یہ دو آدمیوں کے پاس ہو گیا ہے۔ فرمایا نہیں' تمہیں اصل علم اس وقت حاصل ہوگا جب تم مجھے دفن کر کے ستر قوم چلو گے۔ تم سے ایسے کام سرزد ہوں گے کہ دنیا حیران ہوگی۔ شاہ ن ےکہا حضرت صاحب نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ جب سوموار کو شاہ صاحب کے ہاں دعا کی محفل لگتی ہے تو ساہ صاحب کے پس پشت ایک صاحب بیٹھتے ہوتے ہیں انہیں چشتی صاحب کہتے ہیں چشتی صاحب ایک دھیمے مزاج کے ''میں تو کچھ بھی نہیں'' رنگ کے بزرگ ہیں وہ بھی صاحب کشف ہیں۔ میں چشتی صاحب سے ملا میں نے کہا چشتی صاحب آپ صرف سوموار کی شام کو شاہ صاحب کی محفل میں نظر آتے ہیں کیا بات ہے۔

میں پابند ہوں حاضری دیتا ہوں۔

میں نے پوچھا آپ شاہ کے مرید ہیں کیا؟

بولے نہیں ان کی کرم نوازی ہے کہ مجھے پاس بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ میں نے کہا پاس بیٹھنے کا کوئی فائدہ ہوتا ہے کیا؟

بولے بہت فیض حاصل ہوتا ہے ان کے پاس بیٹھتا ہوں تو میری قوت کشف میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے' روشنی بڑھ جاتی ہے' نگاہ

دور تک جاتی ہے میں نے کہا شاہ کا کشف کیسا ہے۔ کہنے لگے بڑا منفرد ہے ایسا کشف کسی اور میں نہیں دیکھا۔ میرا ایک پرانا دوست ہے احمد بشیر کٹر کمیونسٹ خیالات کا مالک ہے وہ پیروں فقیروں یا بزرگوں کو نہیں مانتا چند ایک سال سے احمد بشیر کو علم جعفر سے دلچسپی ہو گئی ہے وہ جگہ جگہ مخطوطوں کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے۔ شاہ صاحب سے اس کی ملاقات صرف اس لئے ہوئی کہ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ علم جعفر حاصل کرنے میں احمد بشیر کی مدد کر سکتے ہیں۔

احمد بشیر نے شاہ صاحب سے بات کی تو وہ بولے بھئی میں نے یہ علم عرصہ دراز سے چھوڑ رکھا ہے البتہ میں نے اپنے ایک دوست پروفیسر علاؤالدین اختر کو ٹرین کر رکھا ہے آپ ان سے مل سکتے ہیں اس ضمن میں احمد بشیر پر کیا بیتی اس نے خط میں مجھے سارا واقعہ لکھ بھیجا۔ احمد بشیر کے الفاظ میں سنئے۔ کئی روز سے مجھے ئی سوال تنگ کر رہا تھا کہ میرے اجداد میں سے کون تھا جو مسلمان ہوا۔ میں نے یہ سوال اپنی کاپی میں لکھ لیا کہ جتنا جعفر آتا ہے اس سے کاوش کروں گا۔ جمعہ آیا تو میں نے سوچا شاہ صاحب سے ملنا چاہیے۔ کاپی اٹھائی اور شاہ صاحب کے ہاں چلا گیا وہاں چلا گیا وہاں پروفیسر علاؤالدین اختر بھی موجود تھے۔

شاہ نے ایک کاغذ کچھ لکھا کر پروفیسر علاؤالدین اختر کی طرف بڑھا دیا پروفیسر مجھے مخاطب کر کے بولے وہ تو تین بھائی تھے۔ میں کچھ نہ سمجھا تو شاہ نے پروفیسر کے ہاتھ سے کاغذ لے کر مجھے دکھایا اس پر لکھا تھا کہ بشیر کے ابا واجداد میں سے کس نے اسلام قبول کیا۔ یہ وہی سوال تھا مجھے تین روز سے پریشان کئے ہوئے تھا اور جسے میں نے کاپی میں لکھا ہوا تھا اب تم میرے عالم تحیر کا اندازہ کر لو۔

پھر میں نے کہا اچھا تو مجھے بتا دیجئے انہوں نے سر جھکایا اور کہا اس کا نام کبیر تھا وہ لمبے قد کا طاقتور اور بہادر تھا للکار کرتا تھا اس نے ایک مسلمان فقیر پر سختی کی جس کے جواب میں مظلوم نے جس کردار کا مظاہرہ کیا اس سے متاثر ہو کر کبیر پنڈت مسلمان ہو گیا۔ اس کا دوسرا بھائی فطرتاً ظالم تھا تیسرا بھائی شریف اور نیک دل تھا لیکن وہ دونوں مسلمان نہ ہوئے یہ بات ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۰ کے بیچ کی ہے تینوں بھائی خوشحال تھے ایک تنگ گلی میں ایک بڑے کے پاس رہتے تھے۔ دوسری باتیں جو انہوں نے کہیں وہ بھی حیرت ناک ہیں۔ اس کے بعد احمد بشیر پروفیسر علاؤالدین اختر کے گھر جا کر انہیں ملا۔ ان سے جفر کی بات کی۔ اختر نے کہا بھی میں جفر بلکل نہیں جانتا نہ ہی مجھے روحانیت سے دلچسپی ہے میں تو شاہ کے پاس اس لئے جاتا ہوں کہ مجھے وہ آدمی پسند ہے اور میں نے اسے دوست بنا رکھا ہے۔

احمد بشیر نے کہا اگر آپ جفر سے دلچسپی نہیں رکھتے تو اس روز آپ نے میرے اجداد کو کیسے دیکھ لیا۔ پروفیسر ہنسنے لگے بولے بھئی وہ تو شاہ جو جو کچھ میرے ذہن میں ڈالتے گئے وہ میں بیان کرتا گیا یہ ساری شعبدہ بازی شاہ صاحب کی تھی۔

اس پر احمد بشیر مزید حیران ہوا پھر وہ شاہ سے ملا کہنے لگا جناب میں تو جفر سیکھنے کا متمنی ہوں۔

شاہ ہنسے بولے احمد بشیر ہم آپ کو پانچویں جماعت میں داخل کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ ضد کر رہے ہیں کہ مجھے پکی جماعت میں داخل کر لو۔

پروفیسر علاؤالدین سے میں نے پوچھا میں نے کہا پروفیسر تمہیں شاہ صاحب کی کون سی بات پسند آئی کہ تم نے ان کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔

پروفیسر نے کہا شاہ ایک منفرد بزرگ ہے۔

میں نے کہا منفرد کا مطلب؟

بولے عام طور پر بزرگ دین کماتے ہیں شاہ سارا دن دنیا کمانے میں مصروف رہتا ہے' اس کی نظر میں دنیا بے حد اہم ہے یہی وہ بوٹا ہے جس پر بہشت یا دوزخ اک پھل لگے گا۔ وہ دنیا تیاگنے کا قائل نہیں کونے میں بیٹھ جھ کر منکا چلانے کا قائل نہیں اس نے کبھی کسی سائل کو ''نہ بی بی نہ'' یا ''جا بابا جا'' نہیں کہا۔ کسی سائل کے آنے پر اس میں ناگواری کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا موڈ کبھی آف نہیں ہوا۔ کبھی تھکاوٹ کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ اس سے پوچھو تو کہتا ہے مین ایک خدوغرض انسان ہوں میں اپنے رب کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ اور بس۔ مین نے پوچھا پروفیسر تم شاہ سے کیسے ملے۔

بولا' میں نے سنا تھا کہ شاہ کا مسلک صرف خدمت خلق ہے میں بہت متاثر ہوا۔ اسے ملنے کے لئے دفتر چلا گیا۔ دفتر میں وہ کسی سے نہیں ملتا۔ اس نے بندہ بھیجا پوچھو کیا کام ہے میں نے کہلا بھیجا کوئی کام نہیں میں تم سے دوستی کرنے آیا ہون اس نے مجھے بلا لیا اور ہم دوست بن گئے۔ شاہ صاحب میں ایک بات بے حد منفرد ہے' عام طور سے بزرگوں کی محفل میں HUSH HUSH کا عالم ہوتا ہے وہ بات کا بھید رکھتے ہیں اشاروں میں بات کرتے ہیں کہہ بھی دیتے ہیں اور نہیں بھی کہتے شاہ صاحب میں کوئی گومگو کا عالم نہون وہ کھل کر برملا بات کرتے ہیں بات کرتے وقت نہ تو ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور نہ تفاخریعں بات کرتے ہیں جیسے پہاڑا پڑھ رہے ہوں۔ احمد دبشیر سے برسبیل تذکرہ بات کرتے ہوئے انہون نے کہا کہ احمد اور وہ دور اب آنے ہی والا ہے شاہ صاحب نے کہا کہ اگرچہ (وقت کا تعین اللہ تعالٰی کی ذات کرتی ہے) لیکن مجھے یہ نظر آتا ہے کہ نومبر ۹۲ء یا جون ۹۳ء میں پاکستان اور ہندوستان میں ایک ایسی جنگ ہونے والی ہے جس کا تصور محال ہے اگرچہ اس مین ایٹم بم استعمال نہیں ہوگا پھر بھی کم وبیش پانچ لاکھ آدمی مریں گے' صرف دو تین ہفتے چلے گی لیکن جب ختم ہوگی تو پاکستان فوج مشرقی پنجاب کے اندر دور تک پہنچی ہوئی ہوگی پھر کشمیر آزاد اور خود مختار

ملک بن جائے گا مشرق ،پنجاب ہندوستان یونین کے اندر ایک آزاد ملک ہوگا جو بفرسٹیٹ بن جائے گا۔ میرے دوست ڈاکٹر ابدال بیلا نے احمد بشیر سے جنگ کی بات سنی تو اس نے شاہ سے پوچھا صاحب یہ کون سی جنگ کی خبر دے رہے ہیں آپ؟۔

بولے پانی پت کی آخری جنگ کی آپ تاریخ دانوں کو بتادیں کہ پانی پت کی تیسری جنگ آخری جنگ نہیں تھی پانی پت کی آخری اور فیصلہ کن جنگ اب ہوگی کاتب تقدیر نے پانی پت کے مقام پر لکیر لگادی ہے جو ہماری سرحد ہوگی لیکن اس کے لئے ہمیں پانچ لاکھ لوگوں کی قربانی دینی پڑے۔ پانچ شہر تباہ ہوں گے پھر ہندوستان آنے والے پچاس سال تک سر نہیں اٹھا سکے گا۔ میں نے کہا' شاہ صاحب ہمیں جنگ کی ضرورت نہیں' فتح کی ضرورت نہیں' توسیع ملک کی ضرورت نہیں' مجھے بتایئے کہ ہمارے قلب کب بدلیں گے اس وقت ہم دولت اور اقتدار کی طمع میں لت پت ہو رہے ہیں ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں ہمارا ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔

اتنا بھی نہیں' وہ بولے' اس کاڑھنی کے اوپر اوپر جو بالائی ہے نا صرف وہ زہر آلود ہوئی ہے اسے اتار پھینکو تو نیچے خالص دودھ موجود ہے۔ میں نے کہا' یہ اوپر کی زہر آلود بالائی کو ہم کب اتار پھینکیں گے۔ کہنے لگے یہ سارا اہتمام ہمارے قلب بدلنے کے لیے تو ہو رہا ہے اس جنگ کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شاہ صاحب اس تباہی میں تخفیف نہیں ہو سکتی کیا؟ ڈاکٹر ابدال بیلا نے پوچھا۔

وہ بولے' اس سے بچنے کی دعا نہ کرو۔ یہ جنگ ہمارے حق میں ہے۔ اس کے بغیر ہمیں استحکام نصیب نہ ہوگا اور ہندو ہماری چھاتی پر سوار رہے گا۔ رہا جانی نقصان تو قیام پاکستان کے وقت بھی لاکھوں نے جان کی قربانی دی تھی اب استحکام کے لیے پھر قربانی دینی پڑی تو گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔

میرا ایک دوست اشفاق حسین ہے' وہ احمد بشیر کا ماموں ہے۔ اشفاق حسین ایمن آباد کا شیخ ہے۔ ایمن آباد کے شیخ نو مسلم ہیں وہ صرف خدا کو مانتے ہیں کسی پیر فقیر یا بزرگ کو نہیں مانتے پیر فقیر کو ماننا بت پرستی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اشفاق حسین ایک ہومیو ڈاکٹر ہے وہ اسلام آباد میں پریکٹس کرتا ہے اس کی پریکٹس بہت کامیاب ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے ہاتھ میں شفا ہے۔ اس بات پر ڈاکٹر اشفاق حسین کو بہت غصہ آتا ہے۔ کہتا ہے' میں محنت کرتا ہوں' جان مارتا ہوں۔ صحیح دوا ڈھونڈتا ہوں اور تم کہتے ہو' میرے ہاتھ میں شفا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔

عجب اتفاق کی بات ہے کہ خود اشفاق حسین پر ہومیو دوا اثر نہیں کرتی لوگ اس کی دوا سے صحت مند ہو جاتے ہیں لیکن وہ خود بیمار رہتا ہے۔ میں نے اشفاق حسین سے کہا' بھائی میرے غم نہ کھاؤ' یہ تو قدرت کا اصول ہے کہ جس کے ہاتھ میں شفا ہوگی وہ خود بیمار رہے گا یہ کیسی منطق ہے۔ وہ غصے سے بولا۔

یہ اس لیے ہے کہ وہ تفاخر کا شکار نہ ہو جائے۔ خدا نہ بن بیٹھے اسے یہ احساس رہے کہ دوا ایک ذریعہ ہے۔ شفا عطیہ خداوندی ہے۔

اشفاق حسین اس بات کو نہیں مانتا۔

گزشتہ آٹھ دس سال سے وہ ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہے کئی ایک سال سے وہ ابلی ہوئی سبزیاں کھا رہا ہے جن میں نمک نہیں ہوتا۔

اشفاق حسین نے شاہ سے کہا کہ شاہ صاحب میں مریض سے پوچھ لیتا ہوں اگر وہ توفیق نہیں رکھتا تو میں اس سے نہ فیس لیتا ہوں نہ دوا کی قیمت۔

اس بات پر شاہ نے اسے سخت جھاڑ جھپاڑ کا خط لکھا۔ شاہ نے لکھا' تم اسے خدمت خلق سمجھتے ہو۔ کیا تم مریض سے پوچھتے ہو کہ اس میں توفیق ہے یا نہیں۔ بغیر پوچھنے کے نہیں سمجھ سکتے کیا تمہاری انا عفریت بن کر تمہارے سر پر سوا ہے۔

اشفاق حسین نے خط پڑھا تو اسے پسینہ آ گیا۔ زندگی میں اسے کبھی کسی نے ایسی جھاڑ نہیں پلائی تھی۔ کہنے لگا یار اس شاہ نے تو میری چولیں ہلا دیں۔ تین مہینے کے بعد اشفاق حسین میرے پاس آیا کہنے لگا' یار میں تیرے پاس ایک کنفیشن کرنے آیا ہوں۔

میں نے کہا میں کیا پادری ہوں اور تو کیا مرنے لگا ہے جو کنفیشن کرے گا۔ بولا نہیں بھئی' اگر میں نے کنفیشن نہ کی تو میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ اچھا تو بول کیا کنفیشن کرنا چاہتا ہے۔ کہنے لگا' جس روز مجھے شاہ نے ڈانٹ پلائی تھی اس روز سے میرا بلڈ پریشر نارمل ہو گیا ہے۔ ''ارے'' میں حیرت سے چلایا۔ ''تو نے یہ بات مجھے کیوں نہ بتائی؟'' کہنے لگا' میرا بلڈ پریشر نارمل ہوا تو میں ہکا بکا رہ گیا کہ یہ کیا ہوا' مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ سوچتا کہ شاید کل پھر بلڈ پریشر ہائی ہو جائے اس وجہ سے میں نے تین مہینے کسی کو نہیں بتایا کہ میرا بلڈ پریشر نارمل ہو چکا ہے۔

شاہ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے انہیں یہ خبر سنائی۔ شاہ مسکرائے' بولے۔ ''یہی میرا اندازہ تھا اس کی انا فرعون بن کر بیٹھی تھی اور بلاکیڈ بنی ہوئی تھی۔ دوا اثر نہیں کرتی تھی اس شدید جھاڑ نے انا بلاکیڈ توڑ دیا۔ شاہ بات ایسے نہیں کرتا جیسے اس نے کوئی معجزہ کر دکھایا ہو۔ وہ یوں بات کرتا ہے جیسے تحلیل نفسی کے زور پر بات کر رہا ہو اس میں کرامت کا رنگ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا' شاہ صاحب آپ اس بات پر حیران کیوں نہیں ہوئے۔

بولے' بھئی یہ تو سائیکی ایٹری کی بات ہے۔ ایک اندازہ لگایا تھا درست ثابت ہوا۔

میں نے کہا' شاہ صاحب یہ بتائیے کبھی کوئی ایسا واقعہ بھی ہوا جس کی وجہ سے آپ پر حیرت طاری ہوئی ہو۔ بولے' ہاں ایک

مرتبہ۔

کہنے لگے' حضرت صاحب بینائی کے لیے دم کیا کرتے تھے اور چھ سات ایسے مریض تھے جن کی بینائی جاتی رہی تھی اور حضرت صاحب کے دم کی وجہ سے بینائی لوٹ آئی تھی۔ حضرت صاحب نے یہ خصوصی دم مجھے بھی عطا فرمایا تھا۔

کہنے لگے کہ ایک سوموار کو دعا کے لیے جمع تھے کہ میرے ایک جاننے والے نے کہا کہ ہمارے فیملی ڈاکٹر کا کمپوڈر کسی وجہ سے بینائی کھو بیٹھا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں اسے لے آؤں' آپ دم کر دیں۔ میں نے کہ لے آؤ۔ میں نے دم ہی کرنا ہے۔ چنانچہ وہ اس کمپاؤڈر کو لے آئے۔ میں نے دم کیا' ابھی دعا مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ شخص بڑے زور سے چیخا کہ مجھے دکھائی دے رہا ہے' مجھے دکھائی دے رہا ہے یونہی چیختے چلاتے وہ باہر دوڑ گیا وہ تو چلا گیا۔ میں اور دیگر حضرات جو وہاں موجود تھے پروردگار کی قدرت کاملہ پر انگشت بدنداں تھے۔ ایک روز احمد بشیر کی ہمشیرہ پروین عاطف نے کہا' شاہ صاحب ایک بات پوچھوں' بولے۔ پوچھیے۔

کہنے لگی۔ ''شاہ صاحب آپ جن تو نہیں ہیں۔''

شاہ ہنسے۔

بولی' دیکھئے نا آپ صبح سے رات گئے تک کام کرتے ہیں۔ کبھی آپ کے چہرے پر تھکاوٹ یا اکتاہٹ کے آثار نہیں دیکھے۔ کبھی آپ کا موڈ آف نہیں دیکھا۔ ظاہر ہے رات کو آپ تین چار گھنٹے عبادت کرتے ہوں گے' صبح کبھی آپ کو اونگھتے نہیں دیکھا یہ سب باتیں مجھے تو جناتی نظر آتی ہیں۔

شاہ صاحب نے کہا' روحانیات کے ابتدائی مراحل میں جنات سے سب کا واسطہ پڑتا ہے' ہمیں بھی پڑا ہے۔ کچھ لوگ اس مرحلے پر قیام کر لیتے ہیں۔ جب میں گود میں تھا تو میری والدہ جنات کے لیے ایک وظیفہ کر رہی تھیں۔ ایک روز انہوں نے مجھے لٹا دیا اور خود مصلے پر بیٹھ کر وظفیہ کرنے لگیں۔ ایک بہت بڑا سانپ آیا اور اس نے مجھے گھیرے میں لے لیا تا کہ والدہ کی توجہ وظیفے سے ہٹ جائے۔ شاہ نے کہا کہ ویسے جنات کا آنا جانا تو رہتا ہی ہے۔ ایک روز سوموار کے دن جب دعا کی محفل جاری تھی یہاں دعا کرانے والوں کا ہجوم تھا تو ایک جن بمعہ تین چڑیلوں کے آ گیا۔ انہیں دیکھ کر سب لوگ ڈر کر بھاگ گئے۔ میں نے اس سے کہا' یہ تم نے کیا کیا؟ خلق خدا کو ڈرا دیا۔ وہ بولا' مجبوری تھی۔ میں بہت بیمار تھا' مجھے آپ کی محفل میں آنا ہی پڑا۔

شاہ کے مرشد حضرت صاحب ہر سال کوہاٹ کالا باغ روڈ پر شکر درہ گاؤں کے قریب ایک وسیع ویرانے میں بیٹھ کر چلہ کاٹا کرتے تھے۔ اس گاؤں کے علاقہ میں پانی نایاب تھا۔ اول تو کنویں سے پانی نکلتا ہی نہ تھا' نکلتا بھی تو بہت کم اور اس قدر کھارا کہ پیا نہ جاتا۔

ایک بار جب وہ چلہ کاٹنے کے لیے وہاں گئے تو شکر درہ کے لوگ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت کچھ کریں تا کہ ہماری پانی کی مشکل دور ہو جائے۔ حضرت صاحب نے ایک جگہ کی جانب اشارہ کیا۔ کہنے لگے' یہاں کھودو' وہاں کھودا تو کنویں سے وافر پانی نکل آیا۔ دوسرے وہ پانی میٹھا تھا۔ اس پر سارے گاؤں والے حضرت صاحب کے عقیدت مند ہو گئے۔

حضرت صاحب کی وفات کے بعد شاہ صاحب ہر سال ایک مقررہ تاریخ کو شکر درہ میں حاضری دیتے ہیں۔ اس روز شکر درہ اور آس پاس کے گاؤں کے لوگ باقاعدہ حضرت صاحب کا عرس مناتے ہیں اور شاہ صاحب اس میں شمولیت کرتے ہیں۔ اس سال جب وہ عرس کی تقریب پر شکر درہ گئے تو ہمیں بھی ساتھ لے گئے۔ اشفاق حسین ڈاکٹر ابدال بیلا اور میں' ہم پشاور سے صبح سات بجے روانہ ہوئے۔ ساڑھے نو بجے شکر درہ پہنچے۔ شکر درہ سے پہلے پندرہ بیس کلومیٹر پھیلا ہوا ایک پہاڑی ویرانہ تھا جو پہاڑوں سے گھرے ہوئے بڑے بڑے میدانوں پر مشتمل تھا' نہ وہاں کوئی گاؤں تھا نہ مکان نہ جھونپڑا نہ گائے' نہ بھینس نہ کتا۔ حیرت کی بات تھی کہ وہاں کوئی پرندہ بھی نظر نہ آیا' نہ کوا نہ چیل نہ چڑی نہ چڑا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ لازماً وہ جنات کا علاقہ تھا جہاں حضرت صاحب جا کر ہر سال چلہ کاٹتے تھے۔ شاہ کے مرشد حضرت یعقوب علی شاہ ہیں۔ انبالہ کے رہنے والے تھے۔ دنیاوی تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ روحانی تعلیم حضرت علاؤالدین علی احمد نے دی' تربیت وارث پاک نے کی۔ ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ لاہور میانی صاحب میں مدفون ہیں۔

شاہ صاحب سے ان کے مرشد کی باتیں کریں تو ان کی آنکھوں میں قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ بند بند سے عزت احترام اور محبت کے چھینٹے اڑتے ہیں جو محفل کو بھگو دیتے ہیں۔ بس ایک ان کا نام لے دو تو یہ عالم ہوتا ہے کہ ایک ذرا چھیڑیئے' پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ شاہ اس محبت اور عقیدت سے حضرت صاحب کی باتیں سناتے ہیں کہ حاضرین لٹ پٹ ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں' تقسیم کے بعد حضرت صاحب سیدھے گجر خان آئے وہاں ریڑھی لگاتے رہے پھر لوہے کا کام شروع کر دیا۔

روز بلاناغہ ٹکٹ لے کر سینما ہال میں جا بیٹھتے' تا کہ جاگتے رہیں اور عین وقت پر فلم ختم ہونے پر رات گیارہ بجے پڑھائی کے لیے گھر پہنچیں۔ ان کی عبادات بھی منفرد تھیں۔

پھر لاہور تشریف لے آئے۔ پہلے اندرون شہر قیام کیا پھر پرانی انارکلی میں جا بیٹھے۔ ایک چھوٹے سے باتھ روم نما کمرے میں رہائش تھی۔ وہی ان کا ڈرائنگ روم تھا' وہی بیڈ روم' وہی کچن اور وہی ڈائننگ روم' لاہور سے پہلے ریڑھی لگاتے رہے بعد میں سب کام چھوڑ دیئے۔ لوگوں سے کچھ لیتے نہیں تھے۔ رزق کا کیا سلسلہ تھا یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ پرانی انارکلی میں سڑک کے کنارے

ایک تھڑا تھا' صبح دس بجے کے بعد وہاں تھڑے پر بیٹھ جاتے۔ محفل یا مجمع لگانے کے حق میں نہ تھے' زیادہ بولتے نہیں تھے دوسروں کو بھی بے مقصد بولنے سے منع فرماتے۔

سرفراز شاہ کو بچپن ہی سے روحانیت کا شوق تھا۔ ان کی والدہ بڑی عابدہ تھیں۔ والدہ کے نانا ولی اللہ تھے۔ ۱۹۷۶ء میں سرفراز شاہ حضرت صاحب کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوئے۔ انہوں نے پڑھنے کے لیے کلام عطا کیا' ساتھ ہی تنبیہ کی کہ اس کلام کے ساتھ دعا نہ مانگی جائے۔ شاہ صاحب نے دعا مانگ لی۔ حضرت صاحب کو علم ہو گیا۔ انہوں نے قطع تعلق کر لیا جو ڈیڑھ سال قائم رہا' دوبارہ حاضری دی۔ تین چار ماہ حاضری دیتے رہے' تب کہیں جا کر حضرت صاحب نے پڑھنے کے لیے کلام عطا فرمایا۔

بعد میں حضرت صاحب نے سرفراز شاہ کو بیٹا بنا لیا۔ جب بھی حاضری دیتے' حضرت صاحب ان کے لیے خود چائے بناتے۔ خود پیالہ دھوتے۔ شاہ صاحب نے اس بات پر کوئی بار احتجاج کیا لیکن حضرت صاحب نہ مانے' کہا کرتے تھے یہ ہمارا کام ہے' ہمیں کرنے دو۔

۱۹۸۴ء کو شاہ کو خلافت عطا ہوئی۔ ۱۹۸۶ء کو حضرت صاحب کا انتقال ہو گیا۔ سرفراز شاہ دنیا کو تیاگ کر کسی حجرے میں بیٹھ کر تسبیح چلانے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ دنیا کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں یہی وہ بوٹا ہے جس پر بہشت یا دوزخ کا پھل لگے گا۔ وہ دنیاوی علوم کو اہمیت دیتے ہیں۔ دنیاوی علوم حاصل کیے بغیر انسان اللہ اور اس کی کائنات کی عظمت کو نہیں سمجھ سکتا۔

وہ اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات سمجھتے ہیں جسے حاصل کرنے کے لیے اسلامی کردار پیدا کرنا ضروری ہے۔ آئیڈیل اسلامی کردار حضور اعلیٰ نے پیش کیا تھا۔

سائنس دانوں دانشوروں اور علم نجوم سے تعلق رکھنے والے علماء کا کہنا ہے کہ ہم ایک ایسی صدی میں داخل ہونے والے ہیں جہاں حیرت انگیز واقعات وقوع پذیر ہوں گے۔ سائنسی تحقیق جو آج تک مادی دنیا تک محدود تھی' اپنا رخ بدلنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ سائنس دانوں کا بیان ہے کہ آج تک ہم نے اپنی تحقیق کا رخ متوازی رکھا ہے لیکن اب ہمیں یہ رخ بدل کر اسے عمودی کرنا ہو گا چونکہ اب ہمارے سامنے ایک دیوار آ کھڑی ہوئی ہے۔ آگے جانے کا راستہ بند ہے لہٰذا ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا۔ پہلے ہم مادی اور باہر کی چیزوں پر تحقیق کرتے رہے ہیں۔ اب ہمیں یہ شعور ہوا ہے کہ اہم ترین چیز مادہ نہیں بلکہ انسان ہے اور انسان کے اندر رکھی گئی وہ طاقتیں ہیں جنہیں ہم ای ایس پی کہتے ہیں یعنی وہ طاقتیں جو ظاہری حواس سے ہٹ کے ہیں۔ ظاہری حواس جن کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ انسان میں ایسی دس طاقتیں موجود ہیں جن میں سے ہم صرف ایک طاقت استعمال کر رہے ہیں۔ نو طاقتیں

ہمارے ذہن یا روح میں خوابیدہ صورت میں موجود ہیں۔

آنے والی صدی میں جب سائنس کا رخ انسان کی جانب ہوگا تو ان طاقتوں کی صحیح نوعیت کا علم ہوگا اور ان طاقتوں کو عمل میں لانے کا دور آئے گا تو بنی نوع انسان کی زندگی یکسر بدل جائے گی۔ ابھی تک ہم جسم اور روح کے باہمی تعلق کو نہیں سمجھے بلکہ ہم نے علمی سطح پر روح کے وجود کو سچے دل سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ آنے والی صدی میں ہم روحانی طاقتوں کو جانیں گے اور تسلیم کریں گے لہٰذا ہم اللہ اور مذہب سے قریب تر ہو جائیں گے۔ جن باتوں کو ہم آج کل معجزات سمجھتے ہیں اور سپر نیچرل جانتے ہیں وہ باتیں ہمیں نیچرل نظر آئیں گی۔ یوں مذہب پر ضعیف الاعتقادی کا الزام ختم ہو جائے گا۔

عالمی نجومیوں اور جوتشیوں کا کہنا ہے کہ آسمانوں پر کرۂ عرض کے اوپر ستاروں کے عجیب وغریب قسم کے جھرمٹ ظاہر ہو رہے ہیں۔ ایسے جھرمٹ جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔

ان کا کہنا ہے کہ کرۂ ارض پر ایک سنہرا دور آیا ہے۔ صلح امن اور سکون کا دور اس دور کے متعلق دو دو تین دہایوں سے پیش گوئی کر رہے ہیں۔ اس دور کو وہ The Golden Age کا نام دیتے ہیں۔

مسلمانوں میں یہ بات زبان زد خلق ہے کہ حضرت امام مہدی کا دور آنے والا ہے۔ اس دور کے متعلق سالہا سال سے بزرگوں نے پیش گوئیاں کی ہیں کہ امام تشریف لائیں گے اور اسلام کے بکھرے ہوئے پھولوں کو پرو کر ہار بنا دیں گے۔ ایک بار پھر مسلمانوں کی حکومت مشرق سے مغرب تک یوں قائم ہو جائے گی جس طرح خلفائے راشدین کے دور میں ہوئی تھی۔ ایک بار پھر آقا اور غلام باری باری اونٹ پر سواری کریں گے۔ ایک بار پھر حکمران کے محل پر زنجیر عدل لٹکے گی۔

آنے والے اس دور میں مسلمان سائنس اور دیگر دنیاوی علوم اور ٹیکنالوجی میں پیش پیش ہوں گے اور اس دور کے بزرگ سائنس دانوں کے دوش بدوش کام کریں گے۔

میری دانست میں سرفراز شاہ اکیسویں صدی کے بزرگوں کا ہراول دستہ ہیں۔

◆◆◆